محدّث

وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا



مجلس التحقیق الاسلامی گارڈن ٹاؤن لاہور

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارف

مُدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی   مُدیر: ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہو رہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

اجرائے مُحدث کے مقاصد

☜ عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!
لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

☜ علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!
لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

☜ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!
لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

☜ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!
لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

☜ آئین وسیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!
لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

☜ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!
لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ **محدث** لاہور

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات ومحاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ **محدّث** لاہور

ج = ۹	محرم الحرام، صفر المظفر ۱۳۹۹ھ	۲/۱

فہرست مضامین

ناشر: حافظ عبد الرحمٰن مدنی ۔ طابع: چودھری رشید احمد ۔ مطبع، مکتبہ جدید پریس ۔ ۴ شارع فاطمہ جناح لاہور

زرِ سالانہ: ۱۵/- روپے ۔ فی پرچہ ۲ ۔ روپے

حرفِ اوّل

معزز قارئینِ "محدّث" سے

محدّث بحمد اللہ اس شمارہ سے نئے سال میں قدم رکھ رہا ہے، ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ قارئین کو "محدّث" کی بےقاعدگی کے سلسلہ میں بہت سی جائز شکایات رہی ہیں، لیکن ہم یہ بھی پوری دیانتداری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے حالات کو سلجھانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے جس میں ہمیں اپنی مسلسل اور مستقل علالت کے باعث کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس دوران ہماری طرف سے بہت سے وعدے بھی کئے گئے، انتظامی تبدیلیاں کی جاتی رہیں لیکن حالات کا سرکش گھوڑا کسی طرح قابو میں نہ آسکا۔ اگرچہ اس ساری تگ و دو میں ایک بات کا ہمیں احساس ہے کہ ہم نے اپنے قارئین کو اعتماد میں نہیں لیا کیونکہ ہم اپنی علالت کی طرح ہی اپنی دینی اور سماجی سرگرمیوں کا ڈھنڈورا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارا اصل مسئلہ انتظامی ہے۔ کارکن با تنخواہ تو رکھے جا سکتے ہیں لیکن ان سے کام کروانے کے لیے ہماری مستقل راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیں اپنی علالت کے ساتھ متنوع مصروفیات ہیں اگر کوئی چیز ابھی تک حاصل نہ ہو سکی ہے تو وہ یہی سکون ہے۔ ہمیں زیادہ دکھ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے احباب کو بذریعہ خطوط بھی اپنی مجبوریوں سے آگاہ نہیں کر سکتے بہرحال ہم نے اب ایک انتہائی اقدام یہ کیا ہے کہ "محدّث" کی ذمہ داریاں ایک "ورکنگ کمیٹی" کے سپرد کر دی ہیں۔ اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں، اور اس کے نتائج مفید اور حوصلہ افزا برآمد ہوتے ہیں یا نہیں، اس کا علم صرف علام الغیوب کو ہے، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری طرف سے حالات کو سلجھانے کی یہ ایک بھرپور اور مخلصانہ کوشش ہے۔ اور ہمیں یہ امید بھی ہے کہ ہماری یہ کوشش ان شاء اللہ بار آور ہو گی اور قارئین کی شکایات کا ازالہ ہو جائے گا۔ قارئین سے صرف یہ درخواست ہے کہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں، اس مشن کی تکمیل میں ہماری کامیابی اور جسمانی صحت کے لیے پرخلوص دعا فرمائیں تاکہ "محدّث" زندہ رہ سکے۔ محدّث ۔ جو ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔!

والسلام

(مدیر)

دار الافتاء

بعض آیاتِ قرآنی کا جواب

چونکہ مسئلہ ہذا فتویٰ، تعلیق، تعاقب، تبصرہ اور جواب تبصرہ کی صورت میں کئی رسالوں میں پھیل گیا ہے۔ لہٰذا ہم محدث میں پوری بحث جمع کر رہے ہیں، تاکہ قارئین ایک ہی جگہ سے مکمل استفادہ کر سکیں۔ (مدیر)

محترمی و مکرمی، استاذ المکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

بعد از آداب و تسلیم یہاں سب خیریت ہے اور خداوند کریم سے دُعاگو ہوں کہ آپ کا سایۂ شفقت ناچیز پر ہمیشہ کے لیے باخیریت طور پر رکھے آمین!

دیگر احوال آنکہ ایک مسئلہ آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں وضاحت فرما کر جواب سے نوازیں۔

وُہ یہ ہے کہ ہم سورۃ "الاعلیٰ" کی پہلی آیت یا دیگر ایسی سورتیں جن میں سوالیہ قسم کی آیات ہیں مثلاً سورۃ غاشیہ اور والتین کے آخر میں جو جوابی کلمات کہتے ہیں کیا یہ حضور علیہ السلام سے بحالتِ نماز ثابت ہیں یا نہیں یا صحابہ کرام کو حکم دیا ہے، وضاحت فرمائیں!

فقط والسلام! خدا حافظ۔ آپ کا تلمیذ طالبِ خیر مسعود الرحمٰن جانباز

خطیب جامع اہلحدیث ایبٹ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الجواب بعون الوہاب

سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا قرء سبح اسم ربک الاعلیٰ قال سبحان ربی الاعلیٰ۔"

اس حدیث میں کلمہ اذا قرء عام ہے اس کے عموم میں حالتِ نماز و غیر حالتِ نماز سب داخل ہیں، اسی طرح اپنے عموم کے اعتبار سے یہ روایت فرضی اور نفلی سب نمازوں کو شامل ہے اس کی تائید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے افعال سے بھی ہوتی ہے چنانچہ سنن کبریٰ بیہقی میں ہے:۔

"انه قرء فی الصبح بسبح اسم ربك الاعلی فقال سبحان ربی الاعلی۔"

یعنی حضرت علیؓ نے صبح کی نماز میں آیت "سبح اسم ربک الاعلیٰ" پڑھی پھر "سبحان ربی الاعلیٰ" کہا، سعیدؓ بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ میں نے ابن عمرؓ کو سنا "سبح اسم ربک الاعلیٰ" پڑھا پھر "سبحان ربی الاعلیٰ" کہا، اس کی مثل حضرت عمرؓ سے بھی منقول ہے۔ ابن زبیرؓ سے ماثور ہے کہ "انہ قرء سبح اسم ربک الاعلیٰ فقال سبحان ربی الاعلیٰ وھو فی الصلوٰۃ" حضرت علیؓ سے یوں بھی منقول ہے "قرء سبح اسم ربک الاعلیٰ فقال سبحان ربی الاعلیٰ وھو فی الصلوٰۃ فقیل له اتزید فی القراٰن فقال لا انما امرنا بشیء فعلته"

حدیث مذکور میں عزیزی نے صحت کا حکم لگایا ہے۔ ابوداؤد میں ہے "خولف ابن وکیع فی ہذا الحدیث رواہ ابو وکیع وشعبة عن ابی اسحاق عن سعید بن جبیر عن ابن عباس موقوفاً"

اسی طرح سورۃ "والتین" اور "لا اقسم" اور "والمرسلات" کے بارے میں لفظ "من قرء" وارد ہوا ہے جو عموم کا متقاضی ہے، حالتِ نماز وغیر حالت میں شامل ہے۔ اسی بناء پر صاحبِ مشکوٰۃ حدیث ابن عباسؓ مذکور اور اس حدیث کو "باب القراءۃ والصلوٰۃ" کے تحت لائے ہیں، لیکن حدیث ہذا کی سند میں راوی مجہول ہے۔ مرعاۃ المصابیح صہ ۶۲۸ جلد اول میں ہے "فی اسنادہ رجل مجھول فالحدیث ضعیف۔"

نیز فتح القدیر للشوکانی صہ ۳۴۳ جزء ۵ میں ہے "وفی اسنادہ رجل مجھول" اور ابن کثیر جزء ۴ صہ ۵۸ پر ہے "وقد رواہ شعبة عن اسمٰعیل بن امیة قال قلت من حدثك قال رجل صدق عن ابی ھریرۃ۔"

ترمذی میں ہے "انما یروی بھذا الاسناد عن ھذا الاعرابی عن ابی ھریرۃ ولا یسمی" فتح الودود میں ہے "ھذا الاعرابی لا یعرف ففی الاسناد جھالة۔"

اس روایت میں لفظ "فلیقل" استعمال ہوا ہے اور احکام القرآن لابن العربی میں "او فی روایة غیرہ اذا قرء او سمع" ہے جو مقتدی کو بھی شامل ہے لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں "وھذہ اخبار ضعیفة۔" ملاحظہ ہو صہ ۱۹۴۱ جزء ۴۔

بہر صورت یہ حدیث ضعیف ہے کما عرفت۔ باقی رہا معاملہ سورۃ غاشیہ کا تو اس بارے میں مجھے کوئی نص نہیں معلوم، ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس سورت کے اختتام پر "اللّٰھم حاسبنی" پڑھا ہو، البتہ مشکوٰۃ جزء ثانی صہ ۴۸۷ پر ایک روایت بحوالہ مسند احمد بایں الفاظ موجود ہے "یقول فی بعض صلوٰته اللّٰھم حاسبنی حسابا یسیرا۔"

تفسیر ابن کثیر جز ۴ ص ۴۸۹ پر ہے "صحیح علی شرط مسلم" یعنی یہ حدیث صحیح اور امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے لیکن اس میں سورۃ غاشیہ کا تعین کرنا امر مشکل ہے، ماحصل خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ الاعلیٰ میں قاری کے لیے جواب کی رخصت ہے۔ اس بیان میں وارد باقی احادیث قریباً ضعیف اور ناقابلِ حجت ہیں، باقی رہا معاملہ سامع مقتدی یا غیر مقتدی کے جواب کا، تو یہ کسی مرفوع حدیث سے ثابت نہیں ہو سکا۔

نیز قاری کے لیے مزید گنجائش بھی ثابت ہے چنانچہ صحیح مسلم احمد اور نسائی میں حضرت حذیفہؓ کی حدیث میں ہے "اذا مر بآیۃ فیہا تسبیح سبح واذا مر بسوال تسأل واذا مر بتعوذ تعوذ" یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرور تسبیح کی آیت سے ہوتا تو آپ تسبیح پڑھتے اور جب سوال سے ہوتا سوال کرتے اور جب تعوذ سے گزر ہوتا تعوذ پڑھتے۔"

نیز تلخیص الحبیر طبع انصاری کے ص ۹۰ میں ہے: "ویستحب للقاری فی الصلوٰۃ وخارجھا ان یسأل الرحمۃ اذا مر بآیۃ الرحمۃ وان یتعوذ اذا مر بآیۃ العذاب۔"

سنن ابی داؤد مع عون المعبود جز اول ص ۳۳۰ پر امام ابوداؤد نے امام احمد سے نقل کیا ہے: "یعجبنی فی الفریضۃ ان یدعو بما فی القرآن" صاحبِ عون المعبود اس جملہ کی تشریحات کرتے ہوئے رقمطراز ہے "فالامام احمد یخص هذا فی النوافل بل یستحبہ فی الفرائض ایضا وبہ قال الشافعیؒ۔"

(۱) لیکن مسند احمد کی روایت میں ساتھ یہ قید بھی موجود ہے "یقراٗ فی صلوٰۃ لیست بفریضۃ" اور بعض روایات میں "صلوٰۃ اللیل" کی صراحت ہے۔

نیل الاوطار ص ۲۲۳ جز ۲ میں ہے "والظاہر استحباب ھذہ الامور لکل قاری من غیر فرق بین المصلی وغیرہ وبین الامام والمنفرد والماموم والی ذلک ذھبت الشافعیۃ" لیکن میری نظر میں اولیٰ یہ ہے کہ اس حکم کو صرف قاری پر محصور کیا جائے جیسا کہ حدیث میں نص موجود ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمہ اتم۔ (حافظ ثناء اللہ مدنی)

تعلیق از حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری

قارئینِ کرام نے محترم حافظ ثناء اللہ صاحب کا جواب اور اس کے دلائل ملاحظہ فرمائے، حافظ صاحب نے اپنا رجحان یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ جوابی کلمات امام کہے مقتدی نہ کہے۔

لیکن ہمارے نزدیک اولیٰ اور اقرب الی الصواب بات وُہ ہے جو حافظ صاحب نے نیل الاوطار کے حوالہ سے پیش کی ہے، یعنی امام شوکانیؒ کے نزدیک یہ کلمات امام اور مقتدی دونوں کے لیے مستحب ہیں۔

ہم مسئلہ زیرِ استفتاء کی مزید وضاحت کے لیے مفتی جماعت حضرت محدث روپڑیؒ کا ... آپ کا علمی وتحقیقی مقام بلانزاع مسلم ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ہماری جماعت میں اساطینِ علم، شیوخ الحدیث، اربابِ تحقیق اور اصحابِ فتوائے کثیر اور معقول تعداد میں موجود تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پورے ہندوستان میں محدث روپڑی کے فتوائے کو جس عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا وُہ مقام کسی دوسرے اہلِ علم کے فتوائے کو حاصل نہ ہو سکا۔ ہمارے لیے مزید وجہ اطمینان یہ ہے کہ ہمیں تو ہر لحاظ سے محدث روپڑی سے نسبت ہے لیکن مذکورۃ الصدر استفتاء کے مفتی عزیزِ مکرم مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب کو بھی انہیں سے شرفِ تلمذ حاصل ہے اور وُہ بھی اپنے تمام اساتذہ سے زیادہ حضرتِ مرحوم کی تحقیق کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم حضرت حافظ صاحب (محدث روپڑی) رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے اخبار تنظیم اہل حدیث (۱۲ جمادی الاول ۱۳۸۲ھ) سے اسی مضمون کا ایک سوال اور خاص اُن کے قلم سے اس کا جواب نقل کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی جن سورتوں کے جوابات حدیثوں میں آ گئے ہیں وُہ جس طرح امام کے لیے جائز اور مستحب ہیں اسی طرح مقتدی کے لیے بھی جائز اور مستحب ہیں بلکہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامعین کا جواب دینا بہت محبوب تھا چنانچہ مشکوٰۃ باب القراۃ میں ہے:

"عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى أَصْحَابِهٖ فَقَرَأَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةَ الرَّحْمٰنِ مِنْ أَوَّلِهَا إِلٰى آخِرِهَا فَسَكَتُوْا. فَقَالَ لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَى الْجِنِّ فَكَانُوْا أَحْسَنَ مَرْدُوْدًا مِنْكُمْ كُنْتُ كُلَّمَا أَتَيْتُ إِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى " فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ " قَالُوْا لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ)

یعنی ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے پاس آئے اور سورۃ رحمٰن ساری پڑھی صحابہؓ خاموش سنتے رہے، آپؐ نے فرمایا میں نے یہ سورت جنوں پر پڑھی تھی جب بھی یہ آیت

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ» پر پہنچتا تو وہ نہایت اچھا جواب دیتے، وہ کہتے لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ ۔ یعنی "اے ہمارے رب تیری کوئی ایسی نعمت نہیں جس کو ہم جھٹلا سکیں، پس تیرے لیے حمد ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہت پیاری لگتی تھی کہ سامعین بھی جواب دیں لہٰذا مقتدی کو جواب دینا چاہیے۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر امام شافعیؒ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سامع بھی جواب دے۔ امام شافعیؒ کے استدلال سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث قابلِ عمل ہے خاص کر فضائلِ اعمال میں! رہی یہ بات کہ نماز غیر نماز میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی سمجھ لینا چاہیے جیسے امام کی آمین کے ساتھ آمین کہی جاتی ہے کیونکہ سماع قراءت کو مخل نہیں، پس اس کا آمین پر قیاس صحیح ہے۔" (بحوالہ "فتاویٰ اہلِ حدیث" جلد ۲ ص ۱۵۴، ۱۵۵)

حضرت میاں صاحب دہلویؒ کی تحقیق انیق و تائید!

مزید اطمینان کے لیے ہم حضرت شیخ الکل فی الکل مولانا و سیدنا نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ المعروف بڑے میاں صاحبؒ کی تحقیق پیش کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ مطبوعہ فتاویٰ نذیریہ جلد اول صہ ۴۲۲، ۴۲۳ میں ان کا اپنا فتوےٰ موجود ہے۔ استفادۂ تام کے لیے ہم سوال و جواب نقل کر دیتے ہیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عمر کہتا ہے کہ آیت "اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ" اور "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى" اور "فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ" وغیرہ آیات کا جواب جس طرح قاری کو دینا چاہیے اسی طرح سامع کو بھی دینا چاہیے اور زید کہتا ہے کہ ان آیات کا جواب صرف قاری کو دینا چاہیے سامع کو نہیں دینا چاہیے پس ان دونوں سے کس کا قول حق و صواب ہے۔ **بینوا توجروا۔**

الجواب، صورت مسئول عنہا میں عمرو کا قول اقرب الی الصواب (حق سے زیادہ قریب) ہے یعنی آیاتِ مذکورہ کا جواب جس طرح قاری کو دینا چاہیے اسی طرح سامع کو بھی دینا چاہیے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بوقتِ قراءت ان آیتوں کا جواب دینا ثابت ہے۔ اور آپؐ کا قول و فعل امت کے لیے ہر وقت دستور العمل ہے تاوقتیکہ اس کی تخصیص کسی

وقتِ خاص، یا شخصِ خاص یا حالتِ خاص کے ساتھ ثابت نہ ہو، مثلاً رفع الیدین اور وضع الیدین علی الصدر (یعنی سینے پر ہاتھ باندھنا) اور رفع سبابہ فی التشہد (تشہد میں انگلی اٹھانا) اور جلسہ استراحت اور تورک اور قبل افتتاح قرأت کے "اللہ اکبر کبیرا۔ والحمد للہ کثیرا و سبحان اللہ بکرۃ و اصیلا" یا انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض یا اللّٰھم باعد بینی و بین خطایای پڑھنا یا رکوع میں سبوح قدوس رب الملئکۃ والروح" اور سجدہ میں سجد لک وجھی وعظامی ومخی پڑھنا وغیر ذٰلک یہ سب ایسے افعال ہیں جن کی مسنونیت میں کسی طرح کا شک نہیں ہو سکتا اور امتِ محمدیہ میں سے ہر شخص کے لیے یہ افعال مسنون ہیں خواہ وُہ شخص امام ہو یا مقتدی خواہ منفرد ہو، حالانکہ یہ کہیں ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقتدیوں کو ان امور کی تعلیم فرمائی ہو یا عام طور پر فرمایا ہو کہ جو شخص جب نماز پڑھے تو ایسا کرے پھر بھی یہ احکام ہر شخص کے لیے اسی وجہ سے عام رہے کہ قول و فعلِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تمام افرادِ امت کے لیے دستور العمل ہوتا ہے جب تک حدیث مرفوع سے ہی تخصیص ثابت نہ ہو قال اللہ تعالیٰ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ الآیۃ پس بنا۔ بر تقریر ہٰذا ان آیات کا جواب ہر شخص کو دینا چاہیے عام ازیں کہ قاری ہو یا سامع، نماز میں ہو یا غیر نماز میں امام ہو یا مقتدی یا منفرد اتباعا لفعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس کے بعد حضرت میاں صاحبؒ نے ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح مسلم سے ان احادیث کو نقل کیا ہے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آیات کا جواب دینا ثابت ہوتا ہے، اس کے بعد آپ جامع ترمذی کے حوالہ سے وُہ حدیث لائے ہیں جس میں آپؐ نے صحابہؓ کی خاموشی پر جنوں کے جواب دینے کا تذکرہ فرمایا اور صحابہؓ کو سورۃ رحمٰن کی مخصوص آیت کے جواب کی ترغیب دی، ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

"اس حدیثِ ترمذی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کی آیتوں کا جواب قاری یا مصلی کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ خود اس کلام پاک کے معنٰی اور موقع کے لحاظ سے ہے۔ جب ہی تو آپؐ نے صحابہ کرام کے سکوت پر اعتراض فرمایا اور جنات کے جواب دینے کو مدحیہ طور پر ذکر فرمایا، حالانکہ آپؐ نے اس سے پہلے صحابہ کرامؓ کو اس جواب کی تعلیم نہیں فرمائی تھی، پس معلوم ہوا کہ خود رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جن جن آیات کا جواب دیا ہے وہ اس خصوصیت سے نہیں کہ آپؐ امام یا قاری تھے بلکہ ان آیتوں کا معنیٰ اور موقعہ ہی ایسا ہے کہ جب وہ آیت پڑھی جائے تو پڑھنے والا اور سننے والا اس کا مناسب جواب جو احادیث سے ثابت ہو دے دے۔

اس کے بعد حضرت صاحب نے اپنی اس تقریر کی تائید میں جامع صغیر کی شرح، شرح صحیح مسلم اور کتاب الاذکار للنووی کی بعض عربی عبارات تحریر فرمائی ہیں جنھیں ہم طوالت کے خوف سے حذف کر رہے ہیں۔ ان عبارات کا جوہری مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ قول "أَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى أَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى" اور "أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ" پڑھے تو "بلیٰ" کہے، کیونکہ ان آیات میں سوال کیا گیا ہے جس کا جواب دینا چاہیے اور خطاب کا حق ہے کہ مخاطب اس کا مناسب جواب دے، اگر نہ دے گا تو سامع غافل اور بے خبر تصور ہو گا یا جیسے کوئی جانور ہے جو آواز تو سنتا ہے لیکن مطلب نہیں سمجھتا یا کسی اندھے، گونگے، بہرے کی طرح جسے کچھ سمجھ نہ آئے۔ یہ حالت بہت بُری حالت ہے۔ (مفہوم عبارات نقل کردہ میاں صاحب)

اس ساری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ آیات کا جواب قاری اور امام کی طرح سامع اور مقتدی کے لیے بھی جائز اور مستحب ہے، اگرچہ واجب کسی پر نہیں۔ بعض نوجوان اہل علم ایسے مسائل میں تشدد پر اتر آتے ہیں تو پرسکون ماحول میں توحش اور ارتعاش پیدا کرنا وجہ افتخار خیال کرتے ہیں۔ یہ روش سلف کے تعامل کے قطعی خلاف ہے۔ ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے اور جہاں دلائل متعارض ہوں وہاں تطبیق کے علاوہ توفیق کا عمل بھی مناسب ہوتا ہے اور دلائل متعارضہ کا حق یہی ہے کہ مسئلہ میں وسعت رہنے دی جائے اور کسی کو کوئی خاص اور معین صورت اختیار کرنے پر نہ مجبور کیا جاتے اور نہ ہی دوسری صورت اپنانے والوں پر طعن وتشنیع کی جائے اور نہ ہی فریقین سے کسی کو بدعتی یا تارک حدیث کہا جائے کہ سلامتی کی راہ یہی ہے۔ (ہفت روزہ اہلحدیث ۲۰ر اکتوبر ۳ر نومبر ۱۹۷۸ء)

تعاقب از مولانا حافظ ثناء اللہ خاں صاحب

فروعی مسائل میں اہلحدیث کا طرز فکر وعمل

مؤقر جریدہ ہفت روزہ "اہل حدیث"، لاہور مورخہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۸ء میں قرآنی آیات

کے جواب کے سلسلہ میں میری رائے کے ساتھ ہمارے محترم دوست مدیرِ اعلیٰ اہل حدیث نے اپنی مخالفانہ رائے کا اظہار بھی ضروری سمجھا ہے اور اس کے لیے انہوں نے جماعت اہل حدیث کی در مایۂ ناز ہستیوں کے فتاویٰ کی اشاعت کی ہے تاکہ اپنے مدعا کو تقویت دے سکیں۔

جہاں تک ان مبارک ہستیوں کے عزت و احترام اور علم و فضل اور اعلیٰ مقام کا تعلق ہے ہمیں ان سے کوئی نسبت نہیں، لیکن مدیرِ اعلیٰ موصوف نے ان کے فتویٰ کو جس انداز میں شائع کیا ہے اور اس ضمن میں اپنی طرف سے جو اصولی بحث (ضعیف حدیث کے قابلِ عمل ہونے کی) اٹھائی ہے موجودہ علمی انحطاط کے دور میں وہ کئی فتنوں کا دروازہ کھول سکتی ہے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ کم از کم اس بارے میں اہل حدیث کے اندازِ فکر کی وضاحت کر دوں کیونکہ اہل حدیث کا نہج فکر مخصوص ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں اہل حدیث علماء کی دو رائے ہوں لیکن اہل حدیث کا مخصوص فکر اگر اپنے امتیازات کھو بیٹھے تو پھر اس مکتبِ فکر کے وجود کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ بعض موقعوں پر عامۃ الناس علماء اہل حدیث کی مختلف آراء دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور اس تذبذب میں پڑ جاتے ہیں کہ اس میں سے کون سا مسلک اہل حدیث کا ہے، حالانکہ مسلک اہل حدیث پیش آمدہ مسائل کے حل میں صرف ایک مخصوص طرزِ عمل سے واسطہ رکھتا ہے جس کی حفاظت علماء اہل حدیث پر فرض ہے۔ ہمارے نزدیک آراء کے باہمی تفاوت کی زیادہ اہمیت نہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم مثالیں پیش کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ غالباً مدیرِ اعلیٰ کو بھی ہمارے اس اصول سے اختلاف نہیں ہو گا۔

اس تمہید کے بعد ہم اپنے جائزہ کو اہل حدیث کے علمی اسلوب کی وضاحت کی غرض سے صرف دو نکتوں پر محدود رکھیں گے۔

اوّلاً: مدیرِ اعلیٰ کا یہ فرمان محدثین کے نزدیک کہاں تک درست ہے کہ:

"ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے"

ثانیاً: مسئلہ مذکورہ کی وضاحت کے لیے محترم بزرگوں کے فتووں کی اشاعت کا انداز تقلیدی تو نہ ہے جب کہ خود ہی یہ بزرگ غیر منقسم ہندوستان میں مقلدین کے خلاف صف آرا رہے ہے شیخ الکل میاں صاحب رحمہ اللہ نے معیار الحق کتاب لکھی اور حضرت الاستاذ محدث روپڑی کی بیشتر تصانیف کا محور یہی موضوع رہا۔ پہلے نکتہ کے لیے ہم اہل حدیث کے متقدمین اور

متاخرین راسخین فی العلم کے چند ایک ارشادات کا مختصر ذکر ہی کافی سمجھتے ہیں ورنہ اس موضوع پر ان بزرگوں نے اس قدر تفصیلی بحثیں کی ہیں کہ ایک مستقل تصنیف بھی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی اور اس موضوع پر ان شاء اللہ کسی فرصت میں ایک مقالہ ہدیۂ ناظرین کروں گا۔ فی الحال ائمہ کے چند ارشادات پیش خدمت ہیں۔

اصولِ حدیث کی مشہور کتاب **قواعد التحدیث** میں علامہ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فقد حکی فیہ عن جماعۃ من الائمۃ انھم لا یرون العمل بالحدیث الضعیف مطلقا کابن معین و البخاری و مسلم و ابی بکر بن العربی الفقیہ وغیرھم و منھم ابن حزم۔" یعنی ائمہ اہل حدیث کی ایک جماعت کی طرف گئی ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل مطلقاً ناجائز ہے (خواہ مسئلہ وجوبی ہو یا استحبابی) ان میں سے ابنِ معین، بخاری، مسلم، ابوبکر بن العربی وغیرہم ہیں، ابنِ حزم کی بھی یہی تحقیق ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ القاعدۃ الجلیلۃ صہ ۸۲ میں فرماتے ہیں "ولو یقل احد من الائمۃ انہ یجوز ان یجعل الشیء واجبا او مستحبا بحدیث ضعیف ومن قال ھذا فقد خالف الاجماع"۔ یعنی ائمہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ کسی ضعیف حدیث سے کسی شے کو واجب یا مستحب قرار دینا جائز ہے اور جو یہ کہتا ہے وہ اجماع کی مخالفت کرتا ہے" گویا مدیرِ اعلیٰ کی یہ بات کہ "ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے" ائمہ اہل حدیث کے اجماع کے خلاف ہے ہند میں اہل حدیث اندازِ فکر کے مشہور نقیب نواب صدیق حسن خانؒ اپنی عربی تفسیر "فتح البیان فی مقاصد القرآن" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں "خطأ من قال انہ یجوز التساھل فی الاحادیث الواردۃ فی فضائل الاعمال" یعنی وہ شخص غلطی پر ہے جو عقیدہ رکھے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث کو بھی لینا جائز ہے۔"

چونکہ مدیرِ اعلیٰ کو یہ غلطی اہل الرائے کے بعض علماء کے طرزِ عمل سے لگی ہے اس لیے محدثین کے اس مسلک کی وضاحت ہم اِن ہی کے حوالہ سے پیش کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحی لکھنوی اپنی تصنیف "الاجوبۃ الفاضلۃ" میں مشہور محقق جلال الدین الدوانی سے نقل فرماتے ہیں "اتفقوا علی ان الحدیث الضعیف لا یثبت بہ احکام الخمسۃ الشرعیۃ ومنھا الاستحباب" یعنی محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث سے کوئی حکم شرعی (وجوب، حرمت، استحباب،

کراہت اور اباحت) ثابت نہیں ہوتا۔ ان سے استحباب بھی ہے۔ عالمِ اسلام کے مشہور محدث علامہ ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ تعالیٰ متذکرہ بالا مغالطے (بعض ائمہ حدیث ضعیف حدیث سے احتجاج میں تساہل روا رکھتے ہیں) کا ازالہ کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں:۔

" ومن نقل عن احمد انہ کان یحتج بالحدیث الضعیف الذی لیس بصحیح ولا حسن فقد غلط علیہ" بحوالہ القاعدۃ الجلیلہ ص ۸۵) یعنی جس نے امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ ضعیف حدیث سے بھی دلیل پکڑتے تھے اس نے آپ پر غلط الزام لگایا ہے اور علامہ احمد محمد شاکر الباعث الحثیث ص ۱۰۱ میں لکھتے ہیں: واَمّا فالذی الامام احمد بن حنبل وعبد الرحمٰن بن مھدی عبد اللہ ابن المبارک اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل ونحوھا تساھلنا فانما یریدون بہ فیما ارجح واللہ اعلم ان التساھل انما فی الاخذ بالحدیث الحسن الذی لم یصل الی درجۃ الصحۃ فان الاصطلاح من التفرقۃ بین الصحیح والحسن لم یکن فی عصرھم مستقرا واضحًا بل کان اکثر المتقدمین لا یصنف الحدیث الا بالصحۃ او الضعف فقط" یعنی "احمد بن حنبل، عبد الرحمٰن بن مھدی اور عبد اللہ بن مبارک کے اس قول، (حرام اور حلال کے بارہ میں مروی حدیث میں ہم سختی کرتے ہیں اور فضائل اعمال کے بارہ میں ہم نرمی کرتے ہیں) کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی نرمی صرف حسن حدیث قبول کرنے تک تھی کیونکہ ان کے زمانہ میں ابھی صحیح اور حسن کا مروجہ فرق نہ تھا بلکہ اکثر متقدمین حدیث کو صحیح کہتے تھے یا ضعیف یعنی وہ حدیث کی صحیح اور ضعیف صرف دو قسمیں کرتے تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ اور مشہور محدث علامہ احمد محمد شاکر کی توجیہات پیش کرنے کے بعد شیخ البانی ایک اور توجیہ اپنی طرف سے بھی پیش کرتے ہیں وہ یہ کہ ان کی مذکورہ نرمی دراصل ان کا یہ رواج تھا کہ وہ ضعیف احادیث کو باسند روایت کرتے تھے کیونکہ اس زمانہ میں ضعیف حدیث کو باسند نقل کرنا اس کی تصحیح یا تضعیف سے کفایت کرتا تھا (ملخصاً)

دراصل قرآنی آیات کے جواب کے بارے میں اس کا استحباب قاری تک محدود رکھنے کے حق میں میری ترجیحی رائے احادیث کے معیار پر مبنی ہے۔ میں نے اپنے جواب میں اس

بارے میں وارد احادیث میں صحت اور ضعف پر بحث کر کے لکھا ہے کہ صحیح احادیث میں سامع مقتدی یا غیر مقتدی کا جواب ثابت نہیں اس لیے میری نظر میں اولیٰ یہ ہے کہ اس حکم استحباب کو صرف قاری پر محصور رکھا جائے۔ یہ بات لکھتے ہوئے میرے سامنے ایک تو احادیث کا معیار تھا کہ سامع کے بارے کوئی صحیح حدیث موجود نہیں جب کہ ہمارے ہاں اہل حدیث میں یہ عمل عام ہو کر عدم توازن کا شکار ہو گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قرآن کی عام آیت رحمت و عذاب پر تو خاموش رہتے ہیں لیکن چند مخصوص صورتوں میں جواب کو سنت قرار دے دیا ہے۔ یہ مروجہ طریقہ سلف میں موجود نہ تھا، اس لیے میں نے یہ رواج مرجوح سمجھا، تیسری وجہ میرے سامنے فقہا۔ محدثین کا یہ اصول تھا کہ عبادت میں اصل حظر (ممانعت) ہے۔ چنانچہ ہمارے جن بزرگوں نے سامع کو بھی قاری پر قیاس کیا ہے انہوں نے اس مذکورہ اصول سے اس مسئلہ میں بے اعتنائی کی ہے۔

چوتھی وجہ چند احادیث ہیں جو نماز کی حالت میں مقتدی کی خاموشی کو کم از کم احتیاطی حیثیت تو دے دیتی ہیں۔ مثلاً حدیث "لا تفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب" اور واذا قرء فانصتوا وغیرہ۔

یعنی سورت فاتحہ کے علاوہ مقتدی خاموشی اختیار کرے۔ قرآن کی آیت "واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون" کا بھی یہی معنیٰ ہے۔

پانچویں وجہ جو حقیقت میں فتوے میں مذکور حضرت شیخ الکل میاں صاحب کے اصول (قول و فعل) کی صحیح تعبیر ہے۔ پیغمبر تمام افراد امت کے لیے دستور العمل ہوتا ہے جب تک حدیث مرفوع میں ہی تخصیص ثابت نہ ہو وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع صرف اس معنیٰ میں جمیع افراد امت کے لیے عام ہے۔ جب فرد کی حالت بھی وہی ہو، یعنی آپ نے اگر کوئی عمل قاری کی حیثیت سے کیا ہے تو یہ امت کے سب قاریوں کے لیے ہو گا۔ علماء اصول نے عموم فعل اور العبرۃ بعموم اللفظ کی مباحث میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے مثلاً قرآن کی آیت واذا قرئ القرآن الآیۃ سے کوئی شخص یہ عمومی حکم نکالے کہ نماز سے باہر ایک شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہو تو اس کے قریب دوسرے تلاوت کرنے والے سب خاموش ہو جائیں تو یہ عموم غلط ہو گا۔

ہمارا خیال ہے کہ مدیر اعلیٰ موصوف بھی اس حکم کو مقتدی اور عام سامع تک

نہیں سمجھتے ہوں گے۔ اس روشنی میں ہماری ترجیحی رائے پر بھی غور فرمائیں کہ ہماری احتیاط کتنا وزن رکھتی ہے۔

اب ہم دوسرے نکتہ پر توجہ دلانا مناسب سمجھتے ہیں، چونکہ جماعت اہل حدیث جو پاک و ہند میں حضرت شیخ الکل اور حضرت الاستاذ محدث روپڑی وغیرہ بزرگوں کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ثمرہ ہے، ان بزرگوں کی کتاب وسنت کے احیاء اور تقلید سے اجتناب کے لیے کامیاب تحریک کے امتیازات آہستہ آہستہ پس پشت ڈال رہی ہے۔ ان بزرگوں نے تو مذاہب اربعہ کے مذہبی تعصب سے نجات دلائی تھی لیکن ہم لوگ ان کی تقلید کے درپے ہو کر پانچواں تقلیدی مذہب اختیار کر رہے ہیں اور آج کل زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ہم ان بزرگوں کے ہر جزوی مسئلہ کو بھی تسلیم کریں حالانکہ اہل حدیث کا مسلک چند فروعی مسائل کی مخصوص تعبیر نہیں ہے بلکہ اہل حدیث کتاب وسنت کی سلفی نہج پر فہم و تعبیر کا نام ہے۔ کسی مخصوص مسئلہ میں اہل حدیث کی دو یا زیادہ آراء سے مسلک اہل حدیث پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اس لیے ہم نے بھی پیش آمدہ مسئلہ میں کوئی سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ استحباب کے دو پہلوؤں میں ایک کو اولیٰ قرار دیا تھا یعنی قرآنی آیات کا جواب صرف استحبابی مسئلہ ہے۔ قاری کے جواب کے حق تک تو ہم بھی مستحب سمجھتے ہیں لیکن سامع کے لیے ضعف احادیث کی وجہ سے جواب کو احتیاط کے منافی سمجھتے ہیں۔ بہت سے ائمہ نے اس حکم کو مزید محدود کیا ہے۔ بعض تو اس کے لیے صرف نفل نماز کی شرط لگاتے ہیں اور بعض صرف منفرد کے لیے جائز سمجھتے ہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مغنی ابن قدامہ جلد اول ص ۵۵۰، سبل السلام جلد اول ص ۲۸۶ وغیرہ۔ (الحدیث، الاسلام، الاعتصام)

مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف کا تبصرہ!

اس سلسلے میں ہمیں دو گزارشات کرنی ہیں۔ اول حدیث ضعیف کے سلسلے میں وہ یہ کہ فاضل مضمون نگار کی حدیثِ ضعیف کے متعلق بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیثِ ضعیف مطلقاً ناقابل اعتبار ہے لیکن یہ اطلاق محلِ نظر ہے، ہم موصوف کو حافظ ابنِ حجرؒ کے اس فیصلے کی طرف توجہ دلائیں گے کہ انہوں نے تین شرطوں کے ساتھ

مشروط کیا ہے۔ تدریب الراوی وغیرہ میں ہے۔

ذکر شیخ الاسلام ثلاثۃ شروط احدھا ان یکون الضعف غیر شدید فیخرج من انفرد من الکذابین والمتھمین بالکذب ومن فحش غلطہ۔ نقل العلائی الاتفاق علیہ۔ الثانی ان یندرج تحت اصل معمول بہ الثالث ان لا یعتقد عند العمل بہ ثبوتہ بل یعتقد الاحتیاط (ص۱۹۶۔ طبع مدینۃ منورہ۔ ۱۹۵۹ء) یعنی شیخ الاسلام (حافظ ابن حجرؒ) نے حدیث ضعیف کے لیے تین شرطیں ذکر کی ہیں۔ (۱) ضعف شدید قسم کا نہ ہو یعنی راوی کذاب یا متہم بالکذب اور خطائے فاحش کا مرتکب نہ ہو (اگر کسی روایت میں اس انداز کا راوی ہو گا تو یہ ضعفِ شدید ہو گا، جس کی وجہ سے روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جائے گی۔ (۲) بیان کردہ روایت کی کوئی ایسی اصل (بنیاد) موجود ہو جو معمول بہ ہو (۳) عمل کرتے وقت روایت کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھے بلکہ احتیاط کے طور پر اس پر عمل کو جائز سمجھے" تیسری شرط کا مطلب یہ ہے کہ اگر حدیث ضعیف میں مذکور عمل کی فضیلت کی کوئی اصل صحیح بھی موجود ہو تو ایسی ضعیف قابلِ عمل ہو سکتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ فاضل موصوف کے استاذ علامہ ناصر الدین البانی، (حفظہ اللہ) جو ضعیف احادیث کے معاملہ میں کافی متشدد بتائے جاتے ہیں۔ اس توجیہ سے شاید ان کو بھی انکار نہ ہو جیسا کہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ کا بھی رجحان اسی طرف ہے۔ فاضل تنقید نگار نے حضرت الامامؒ کی جس عبارت کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔ وہ عبارت یہ ہے۔ (یعنی ایک طویل بحث کے سلسلے میں)

لکن احمد بن حنبل وغیرہ من العلماء جوزوا ان یروی فی فضائل الاعمال مالم یعلم انہ ثابت اذا لم یعلم انہ کذب وذلک ان العمل اذا علم انہ مشروع بدلیل شرعی وروی فی فضلہ حدیث لا یعلم انہ کذب جاز ان یکون الثواب حقا ولم یقل احد من الائمۃ انہ یجوز ان یجعل الشیء واجبا او مستحبا بحدیث ضعیف ومن قال ھذا فقد خالف الاجماع وھذا کما انہ لا یجوز ان یحرم شیء الا بدلیل شرعی لکن اذا علم تحریمہ وروی حدیث فی وعید الفاعل لہ ولم یعلم انہ کذب جاز ان یرویہ فیجوز ان یروی فی الترغیب والترھیب مالم یعلم انہ کذب الی اخر ما قال (التوسل ص۸۴، ۸۵)

دوسری بات زیر بحث مسئلہ کے متعلق ہے۔ سو اولاً ہمارے ہاں اس رواج کا کہ مقتدی بلند آواز سے یہ "جوابات" دیتے ہیں، کوئی جواز معلوم نہیں ہوتا۔ ثانیاً مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی صـ ۲۱۵ ج ۴) میں زیر حدیث متعلقہ جواب آیت سورۃ والتین فرمایا ہے،

"والحدیث یدل علی ان من یقرأ ھذہ الآیات یستحب لہ ان یقول تلک الکلمات سواء کان فی الصلوٰۃ او خارجھا واما قولھا للمقتدی خلف الامام فلم اقف علی حدیث یدل علیہ انتہیٰ"۔

یعنی" اس حدیث سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ قاری کا "الیس اللہ باحکم الحاکمین" کے بعد "بلیٰ وانا علیٰ ذلک من الشٰہدین" کہنا مستحب ہے۔ وُہ قاری نماز کے اندر ہو یا نہ ہو لیکن امام کے پیچھے مقتدی کا کہنا جہاں تک مجھے علم ہے" کسی حدیث میں نہیں آیا ہے۔" مولانا عبیداللہ صاحب مبارکپوری مدظلہ کا بھی فیصلہ یہی ہے۔

"والحدیث یدل علی ان من یقرء ھذہ الآیات یستحب لہ ان یقول تلک الکلمات سواء کان فی الصلوٰۃ او خارجھا واما قولھا للسامع المقتدی او غیر المقتدی فلم اقف علی حدیث مرفوع صریح یدل علی ذلک۔ الخ"

(مرعاۃ المفاتیح صـ ۶۸ ج ۳ جلد اول طبع المکتبۃ السلفیہ لاہور)

رہی وُہ بات جو مرعاۃ میں متاخرین شافعی فقہاء سے نقل کی گئی ہے تو اس کی حیثیت نکتہ آفرینی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ ھٰذا ما عندنا واللہ اعلم (ہفت روزہ الاعتصام ۲۹ دسمبر ۱۹۷۸ء)

جوابِ تبصرہ از مولانا حافظ ثناءاللہ خاں صاحب

ضعیف خبر اجماعِ امت کی رُو سے ناقابلِ اعتبار ہے میں نے موقر جریدہ "اہل حدیث لاہور" مجریہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں بعض قرآنی آیات کے جواب دینے کے مسئلہ پر قاری کے لیے اس کا استحباب صحیح حدیث سے ثابت کیا تھا اور اس کے ضمن میں سامع کے لیے وارد روایات کا ضعف بھی بیان کیا تھا۔ آخر میں اپنی ترجیحی رائے میں یہ اظہارِ خیال کیا تھا کہ سامع کے لیے جواب نہ دینے میں احتیاط ہے۔ کیونکہ اس بارے میں احادیث ثابت نہیں ہیں۔ اس فتوے کی اشاعت کے لیے مدیر اعلیٰ "اہل حدیث" نے اپنی مخالفانہ رائے کے لیے یہ اصول پیش کیا تھا "ضعیف حدیثوں سے وجوب

تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے" جس پر میں نے فروعی مسائل میں اہل حدیث کے طرزِ فکر و عمل کی وضاحت کے لیے تبصرہ مناسب سمجھا اور اس اصولی بحث پر اپنا آرٹیکل اشاعت کے لیے مختلف رسائل کو بھیجا۔

ہفت روزہ "الاسلام" گوجرانوالہ نے اسے بعینہٖ شائع کیا اور ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور نے بھی عنوان تبدیل کر کے اس کی اشاعت کی۔ ہم واجب الاحترام حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس پر اپنی طرف سے ملاحظات بھی پیش فرمائے اور نفس مسئلہ کی نہ صرف پر زور تائید کی بلکہ اس سلسلہ میں جماعت اہل حدیث کے درمایۂ ناز بزرگوں کی تائیدی کلام بھی نقل فرمائی۔ اگر صرف فتویٰ کی تائید ہمارا مقصود ہوتی تو ہمارے لیے حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف جیسے بزرگ کی اس مسئلہ پر حتمی رائے کافی تھی جو ہمارے لیے موقف سے بڑھ کر تائید ہے۔ لیکن ہمیں یہ یقین نہیں آ رہا کہ محترم موصوف اہل حدیث مکتبِ فکر کے امتیازی اصولی مسئلہ کے بارے میں محدثین کبار سے اختلاف رائے فرما سکتے ہیں کیونکہ زیر بحث مسئلہ کی تائید کے ساتھ ہی ہمارے اٹھائے ہوئے اصولی مسئلہ پر انہوں نے تعاقب فرمایا ہے چنانچہ موصوف نے اولاً موضوع بحث کو کچھ بدل دیا ہے۔ ہمارے زیرِ نظر صرف یہ جائزہ لینا تھا (کہ ضعیف حدیث سے وجوب تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہوتا ہے) اہلِ حدیث کا اندازِ فکر ہے یا نہیں۔ لیکن محترم موصوف اس موضوع کو بدل کر فرماتے ہیں کہ راقم (ثناء اللہ) کے نزدیک حدیث ضعیف مطلقاً" ناقابلِ اعتبار ہے لیکن مولانا موصوف کی رائے میں یہ اطلاق محلِ نظر ہے۔ چونکہ ہم پاکستان میں محدثین کا طرزِ عمل و فکر کا انحطاط دیکھ رہے ہیں، اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی وضاحت مناسب طور پر ہو جائے لہٰذا ہم پہلے یہ واضح کریں گے کہ محققین ائمہ حدیث شرعی احکام کے ثبوت میں ضعیف حدیث کا اعتبار نہیں کرتے۔

چونکہ استحباب پانچ شرعی تکلیفی احکام میں سے ایک حکم ہے لہٰذا یہ کسی ضعیف خبر سے ثابت نہیں ہوتا۔ پھر یہ بتائیں گے کہ جن ائمہ حدیث نے ضعیف حدیث کی روایت یا اس پر عمل کے لیے چند شروط لگائی ہیں، ان کا اصل مقصد اور ماحصل کیا ہے اور ہم کس طرح آج انحطاط علمی کے دور میں ان شروط کا اہتمام نہ رکھ سکنے کی وجہ سے حدیث کے سلسلہ میں نہ صرف غث و سمین کی تمیز ختم ہو گئی ہے بلکہ لوگ ہر طرح کی ضعیف خبر پر عمل سے بڑھ کر

اسے عقیدۂ سنت سے قابل استدلال ٹھہراتے ہیں۔

اب ہم پہلے نکتہ کو لیتے ہیں کہ حدیثِ ضعیف سے کوئی حکم شرعی تکلیفی (وجوب، استحباب، اباحت، کراہت، حرمت ثابت نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ہم جہابذۂ محدثین کے بعض اقوال اپنے پہلے تبصرہ میں پیش کر چکے ہیں۔ دیگر بے شمار تائیدات اور وضاحتیں علمِ حدیث کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ ہم ان شاء اللہ کسی دوسری فرصت میں وہ تفصیلاً عرض کریں گے۔ فی الحال اس نکتہ پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے محدثین کا جو اجماع ہم نے نقل کیا تھا اُس کے متعلق وضاحت کرنا کافی ہو گا کیونکہ محترم مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے غلطی سے یہی عبارت ضعیف حدیث کے قابلِ اعتبار ہونے کے لیے پیش کر دی ہے اور اس عبارت کا کچھ زیادہ حصّہ نقل فرمایا ہے کہ شاید ضعیف حدیث سے استحباب کے لیے گنجائش نکل سکے، لیکن اصل رائے جس سے ضعیف حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے کا حتمی فیصلہ ہوتا ہے وُہ چھوڑ دی ہے لہٰذا اب ہم عبارت کو وہاں سے شروع کرتے ہیں، عبارت یُوں ہے:

"ولا یجوز ان یعتمد فی الشریعۃ علی الاحادیث الضعیفۃ التی لیست صحیحۃ ولا حسنۃ لکن احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ من العلماء الخ" (التوسل ص۸۴، ۸۵)

مولانا محترم نے ترجمہ نہیں دیا لہٰذا ہم تفہیم عبارت مکمل طور پر کئے دیتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ محدثین کا اتفاق اور اجماع کیا ہے اور اختلافی نکتہ کیا ہے؟

"شریعت میں صحیح اور حسن احادیث کے علاوہ ضعیف پر اعتماد جائز نہیں لیکن احمد بن حنبل رح وغیرہ بعض علماء نے اعمال کی فضیلت کے ذکر میں بعض ایسی روایات کے صرف نقل کی اجازت دی ہے، جن کے صحت کے درجہ تک پہنچنے کا علم نہیں ہو سکا، بشرطیکہ ان کا جھوٹ بھی نامعلوم ہو، وجہ یہ ہے کہ جب اصل عمل تو صحیح دلائل سے مشروع ہو اور اس مشروع عمل کی فضیلت کے بارے میں ایسی حدیث (خفیف ضعیف) ذکر کر دی گئی جس کا جھوٹ ہونا معلوم نہیں، تو نفس عمل مشروع ہونے کی بناء پر ثواب تو درست ہے (البتہ ضعیف حدیث سے ثواب کی کیفیت یا کمیت کا تعلق ہی باقی رہ جائے گا جو اسرائیلیات کے درجہ کی بات ہو گی۔ ظاہر ہے کہ جب اسرائیلی روایات شرع محمدی کے خلاف نہ ہوں تو وعظ و نصیحت میں ان کا ذکر جائز ہے لیکن مسائل میں ان کا کسی درجہ اعتبار نہیں) فرماتے ہیں کہ کوئی امام (بشمول احمد بن حنبل رح وغیرہ) یہ نہیں کہتا کہ ضعیف احادیث کا اعتبار کر کے کوئی بات واجب یا مستحب قرار دینی

جائز ہے اور جو شخص (ضعیف حدیث کے کسی درجہ اعتبار کی) یہ بات کرتا ہے وہ اجماع امت کی مخالفت کرتا ہے۔ (خطوط وحدانی میں مذکور باتیں بھی ابن تیمیہؒ کی اگلی عبارت کا مفہوم ہیں)

متذکرہ بالا عبارت سے حسب ذیل باتیں حاصل ہوتی ہیں۔

(ا) صحیح اور حسن حدیث کے علاوہ ضعیف احادیث پر اعتبار جائز نہیں

(ب) پوری امت اس بات پر اجماع کر چکی ہے کہ ضعیف حدیث سے وجوب یا استحباب جائز نہیں اور ائمہ سے اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(ج) محدثین کے نزدیک معرض استدلال اور روایت میں ضعیف احادیث کا اعتبار نہیں لیکن احمد بن حنبلؒ وغیرہ بعض علماء چند شروط سے فضائل اعمال میں ان کی صرف روایت جائز سمجھتے ہیں۔

لیکن روایت حدیث کے بارے میں بھی محدثین کا مسلک صحیح مسلم کے مقدمہ سے ملاحظہ فرمائیے۔

حافظ ابن رجب حنبلیؒ شرح ترمذی (ق ۲/۱۱۲) میں فرماتے ہیں۔

"وظاھر ما ذکرہ مسلم (یعنی الصحیح) یقتضی انہ لا تروی احادیث الترغیب الا عمن تروی عنہ الاحکامؒ"

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ظاہراً یہ مسلک بیان کیا ہے کہ ترغیب و ترہیب (فضائل اعمال) میں بھی صرف وہ احادیث روایت کی جائیں جو احکام میں روایت کی جاتی ہیں یعنی محدثین کا اختلاف ضعیف حدیث کی صرف روایت میں ہے۔ اس کے اعتبار نہ کرنے پر سب متفق ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ بعض اعمال کا تساہل روایت کی حد تک ہے۔

غور فرمائیے اس دور میں جب کہ احادیث کی تدوین مکمل نہیں ہوئی تھی اگر احمد بن حنبلؒ وغیرہ بعض شرائط کے تحت ضعیف احادیث کی روایت بھی روا نہ رکھتے تو آج ہم بہت سی ایسی ضعیف روایات سے محروم رہ جاتے جو شواہد اور توابع کی بناء پر مفید ہوتیں۔ خصوصاً جبکہ حدیث حسن بھی اس دور میں ضعیف کی قسم شمار ہوتی تھی، حالانکہ حسن قابل اعتماد ہے یہ وضاحت ہم پہلے تبصرہ میں بھی کر چکے ہیں۔

محدثین کا اختلاف بیان کرنے کے ساتھ مناسب ہو گا کہ یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ ضعیف سے استحباب کن لوگوں کا مسلک ہے اور اس بدعت کی ایجاد کا باعث کیا ہے؟

ہم پہلے ابنِ تیمیہؒ سے یہ نقل کر چکے ہیں کہ پوری امت کا ضعیف حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے پر اجماع ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل الحدیث کے علاوہ اہل الرائی بھی ضعیف حدیث کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں لیکن دورِ تقلید و انحطاط میں جب مسلک کو ضعیف احادیث سے تائید دینے کی حزبی ضرورتیں پیش آئیں تو متعصبین نے بعض اصول ایجاد کیے جن میں سے ایک یہ تھا کہ ضعیف حدیث کے مطابق ان کے امام کا عمل مل جائے تو ایسی حدیث قابلِ عمل سمجھی جائے گی۔ پھر جب اس اصول کا استعمال معرضِ استدلال میں ہوا تو اس نے یہ شکل اختیار کی کہ ضعیف حدیث سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بعض متاخرین اہل الرائی کی کتابوں میں ملتی ہیں اگرچہ ان کی تائید کے لیے انہوں نے متقدمین اہل الرائی یا بعض محدثین سے حسبِ منشا استنباطات کی کوشش کی ہے لیکن احمد بن حنبلؒ وغیرہ کے مسلک کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

اب ہم بعض محدثین کی ضعیف احادیث کی روایت اور شرائط پر گزارشات پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے تدریب الراوی کے حوالہ سے چند شروط کا ذکر کیا ہے۔ یہ شروط اگرچہ طالبانِ حدیث کے ہاں معروف ہیں لیکن ان شروط سے ذہول بہت عام ہو چکا ہے میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ کے کلام اور اس کے مفہوم کے لیے ان کے شاگردِ خاص حافظ سخاویؒ کی کتاب "القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع" صہ ۲۵ طبع مدینہ منورہ کے حوالہ سے نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

"وقد سمعت شیخنا مرارا یقول وکتبه لی بخطه ان شرائط العمل بالضعیف ثلاثة الاول متفق علیه ان یکون الضعف غیر شدید فیخرج من انفرد من الکذابین والمتهمین بالکذب ومن فحش غلطه الثانی ان یکون مندرجا تحت اصل عام فیخرج ما یخترع بحیث لا یکون له اصل اصلا۔ الثالث ان لا یعتقد عند العمل به ثبوته لئلا ینسب الی النبی صلی اللہ علیه وسلم ما لم یقله۔"

ہم نے اپنے استاذ حافظ ابنِ حجرؒ سے کئی بار سنا اور انہوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا کہ ضعیف حدیث پر عمل کے لیے تین شرطیں ہیں۔ پہلی جس پر اتفاق ہے یہ ہے کہ ضعف شدید نہ ہو تاکہ جھوٹوں اور جھوٹ کے ساتھ متہم اور جن سے روایتِ حدیث میں بڑی غلطیاں

ہونیں سے احتراز ہو جائے، دوسری یہ ہے کہ وہ حدیث ایک عام اصل کے تحت ہو تاکہ جس حدیث کا کوئی اصل صحیح ثابت نہ ہو اس سے بچا جا سکے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے سنت ہونے کا عقیدہ نہ ہو کیونکہ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وہ بات منسوب ہو جائے گی جو آپ ﷺ نے نہیں فرمائی۔

ان شرائط کی علیحدہ علیحدہ تشریح بھی پیش خدمت ہے۔ پہلی شرط کا معنی یہ ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کے لیے حدیث کی حالت کی واقفیت ضروری ہے تاکہ شدید ضعف سے بچا جا سکے۔ اس شرط کو پیش نظر رکھ کر غور فرمایئے کہ ہمارے ہاں آج وہ لوگ کتنی تعداد میں ہیں جو احادیث کی صحت کے معیار کو سامنے رکھ کر گفتگو کر سکیں لہ

خصوصاً احوالِ رواۃ کے سلسلہ میں جب مختلف ائمہ کی طرف سے جرح و تعدیل کا اختلاف ہوتا ہے تو اس میں ترجیح دینا کتنا مشکل امر ہے کجا یہ کہ راوی کی عدالت اور ضبط کی باریکیوں کو سامنے رکھ کر معیارِ حدیث کے متعلق کوئی پختہ رائے قائم کی جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ کام ناممکن ہے لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس معیار کا فیصلہ کر سکنے والے بہت کم لوگ ہوں گے۔ نتیجتاً ضعف شدید اور ضعف خفیف کا امتیاز مٹ جائے گا اور بیشتر دفعہ ضعف شدید نظر انداز کر دیا جائے گا۔

دوسری شرط کا معنٰی یہ ہے کہ ضعیف حدیث میں مذکور مسئلہ کا اصل صحیح حدیث سے ثابت ہو مثلاً کوئی عمل اصلاً تو صحیح حدیث سے مشروع ہے لیکن اس پر ثواب کا ذکر ضعیف حدیث میں آیا ہو۔ غور فرمایئے کہ بات عمل کی ہو رہی تھی اور عمل صحیح حدیث سے مشروع ہے۔ حالانکہ ثواب کا تعلق انسان سے نہیں وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ضعیف احادیث پر عمل سے کیا فرق پڑا؟! اصل عمل تو صحیح حدیث پر ہے، ضعیف پر نہیں۔

لہ ساتویں صدی ہجری کا امام حدیث حافظ ابن الصلاحؒ اس فن میں لوگوں کی کمزوری دیکھ کر تو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اب کسی حدیث پر نئے سرے سے صحت اور ضعف کی تحقیق مشکل ہے۔ اس لیے ہمیں متقدمینِ حدیث کی تصحیح اور تضعیف پر اکتفا کرنا چاہیے۔ یہاں سے کسی کو تقلید کا وہم نہ پڑے کیونکہ واقعات کی تحقیق اور انکا صحت و ضعف قریبی دور میں ممکن ہوتا ہے لمبا عرصہ گزرنے کے بعد کسی واقعہ کی مستقل براہِ راست تحقیق بڑی مشکل ہوتی ہے۔ نیز تقلید کا تعلق درایتِ فقہی سے ہے روایت سے نہیں ہے۔ جیسا کہ علماء امت نے وضاحت کی ہے۔

تیسری شرط کا مطلب یہ ہے کہ ضعف خفیف کے باوجود اس مسئلہ پر عمل کرتے وقت اس کے شرعی ہونے کا عقیدہ نہ رکھے کیونکہ شرع کے ثبوت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل صحیح اور ثبوت ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا شرائط سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صحیح حدیث کے علاوہ ضعیف پر عمل جائز نہیں۔ البتہ مخالف جانب کے لحاظ سے ایسا ممکن ہو گا کہ بعض ان ضعف والی احادیث پر جن میں ظاہراً ثواب کا ذکر ہے لیکن مسئلہ صحیح حدیث سے ثابت ہے ضعیف احادیث پر عمل کا وہم پڑے گا حالانکہ وہاں اصل عمل صحیح حدیث پر ہو گا۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی جو عبارت پہلے گزر چکی ہے جس کے متعلق ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی وضاحت ہم شروط کی بحث میں کریں گے۔ ابن تیمیہؒ وہاں ایسی شروط کا لحاظ رکھ کر امام احمدؒ کی رائے کی وضاحت کر رہے ہیں لیکن ابن تیمیہؒ کی رائے میں امام کے نزدیک ایسی شرائط کا تعلق روایتِ حدیث سے ہے عملِ حدیث سے نہیں، اس لیے روایت حدیث کی صورت میں ان شرائط کا لحاظ یا صرف صحیح حدیث پر عمل کی رائے رکھنا ایک ہی معنی رکھتا ہے۔

ہمارا دل چاہتا ہے کہ محدثین کا طریقِ روایت اور روایت میں صحت و ضعف کے اعتبار کے لحاظ سے ان کے عمل پر بحث کریں اور یہ بتائیں کہ وہ کسی نہ کسی انداز میں روایت کرتے وقت بھی صحت اور ضعف کی نشاندہی ضروری سمجھتے تھے لیکن اس کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم اس نکتہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم اپنی گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے اپنے استاذ شیخ ناصر الدین البانی جن کے بارہ میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وہ شروط بالا کے اس توجیہ سے اختلاف نہیں کریں گے کہ ضعیف حدیث قابلِ عمل ہو سکتی ہے کے مسلک کی وضاحت ان ہی کے کلام سے کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ استاذ محترم کی کلام بلفظہٖ ملاحظہ فرمائیے: "وجملة القول اننا ننصح اخواننا المسلمين في مشارق الارض ومغاربها ان يدعوا العمل بالاحاديث الضعيفة مطلقًا وان يوجهوا همتهم الى العمل بما ثبت منها عن النبي صلى الله عليه وسلم ففيها ما يغني عن الضعيفة وفي ذلك منجاة من الوقوع في الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم لاننا نعرف بالتجربة ان الذين يخالفون في هذا قد وقعوا في ما ذكرنا من الكذب لانهم يعملون بكل ما هب ودب من الحديث وقد اشار صلى الله عليه وسلم الى هذا بقوله كفى بالمرء كذبا

ان یحدث بکل ما سمع رواہ مسلم فی مقدمۃ صحیحہ وعلیہ اقول کفی بالمرء ضلالا ان یعمل بکل ما سمع۔"

"ہم مشرق و مغرب میں اپنے مسلمان بھائیوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ ضعیف احادیث پر عمل کو کلی طور پر ترک کر دیں اور اپنی ہمتوں کو صرف انہی احادیث پر مرکوز کر دیں جو نبی علیہ السلام سے ثابت ہیں۔ ان میں وہ چیز موجود ہے جو ضعیف احادیث سے انسانوں کے لیے کافی ہو اور اس میں نجات ہو۔ چہ جائیکہ انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ کا ارتکاب کر بیٹھے کیونکہ ہم تجربہ کی بناء پر جانتے ہیں کہ جو لوگ اس میں مخالفت کرتے ہیں وہ کذب میں واقع ہوئے ہیں کیونکہ وہ ہر قسم کی غث وسمین پر عمل کے عادی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ انسان کے لیے یہی جھوٹ کافی ہے کہ وہ ہر سنی بات بیان کر دے اور میں کہتا ہوں یہی گمراہی کافی ہے کہ ہر سنی بات پر عمل کرے"۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ محققین علماء امت اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت اور اس کی جزئیات خواہ وہ عمل ہوں یا فضائل اعمال ان کا اعتبار اسی صورت میں ہو گا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ نقل صحیح ثابت ہوں۔ اگر کوئی چیز آپ سے ثابت نہ ہو یا اس کی نسبت آپؐ کی طرف ضعیف ہو تو اسے مشروع نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ یہ وعید بالفاظ تواتر ثابت ہے۔ من کذب علیّ متعمدا فلیتبوّأ مقعدہ من النار۔ (بخاری) یعنی جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قصداً جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ آپؐ پر جھوٹ کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی بات کے بارے میں آپؐ کی نسبت اعتماد نہ ہو کہ وہ آپؐ ہی کا قول وفعل اور تقریر ہے اور وہ یقینی صیغوں سے آپؐ کی طرف نسبت کی جائے۔

ضعیف حدیث کے بارے میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ لہٰذا اس کی اتباع کی صورت میں ظن مرجوح پر عمل لازم آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی ہے۔ ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ شکریہ! (مینیجر)

تحقیق و تنقید

مولٰنا برق التوحیدی

مرتد عورت، حالتِ زنا میں قتل اور بیٹے کے بدلے باپ کے قتل کا حکم

(بسلسلہ اسلام کا قانون جنایت (قسط نمبر ۷)

الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی ۔ اما بعد

قاضی بشیر صاحب نے اپنے مضمون کی قسط ۹ کی ابتدا جس بحث سے فرمائی ہے اس پر ہم بالاختصار پہلے بھی کچھ عرض کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ دار الحرب ساقطِ قصاص ہے یا نہیں یعنی عصمتِ دم میں اسلام معتبر ہے یا دار الحرب۔ احناف کے نزدیک عصمتِ دم کا مدار مقام اور جگہ ہے۔ یعنی اگر کوئی مسلمان دار الحرب میں مارا جائے تو اس کے قاتل پر قصاص نہیں ہوگا۔ اور یہ کہ خطاء کی صورت میں اس پر دیت ہوگی جبکہ شوافع کا خیال ہے کہ مسلمان خواہ کہیں بھی ہو جب تک وہ مسلمان ہے معصوم الدم ہوگا اور اس کا قتل قابلِ قصاص جرم ہے۔ البتہ دار الحرب میں اس کا اسلام معلوم ہونا ضروری ہے اور یہی مسلک قرینِ شریعت معلوم ہوتا ہے جبکہ قاضی صاحب نے علامہ جصاص کے حوالہ سے احناف کے مسئلہ کو صحیح قرار دیا ہے ۔۔۔۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے اپنے مدعٰی کی تائید میں احکام القرآن کے حوالہ سے جریر بن عبد اللہ کی روایت پیش کی ہے اور عقبہ بن مالک، اسامۃ ابن زید کی روایات بھی لکھی ہیں جس میں ہے "ھلا شققت قلبہ" حالانکہ یہ روایات تو دراصل شوافع کی دلیل ہیں نہ کہ احناف کی۔ امام شافعیؒ اپنے دلائل ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "وھٰکذا کل من قتلہ وھو یعلمہ مسلما منھم او اسیرا فیھم

او عندھم لتجارۃ او رسالۃ او غیر ذٰلک فعلیہ فی العمد القود" الخ (الام ص ۳۰ ج ۶)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"ولو قتلہ فی صف المشرکین فقال قد علمت انہ مومن فعمد تہ قتل بہ" (الام ص ۳۱ ج ۶)

یعنی اگر کوئی یہ علم ہونے کے باوجود کہہ دے کہ مقتول مسلمان ہے تو اس پر قصاص ہوگا۔"

اس کے علاوہ متعدد ایسی احادیث آئی ہیں جن میں آپ نے فرمایا ہے کہ "اذا قالوا لا الٰہ الا اللہ عصموا منی دماءھم واموالھم وحسابھم علی اللہ"۔

ایسی متعدد احادیث نقل کرنے کے بعد امام بیہقی نقل فرماتے ہیں کہ:

"فاعلم ان حکمهم فی الظاهر ان تمنع دماءهم باظهار الایمان وحسابهم فی المغیب علی الله"۔ (بیہقی ج۸ ص۱۹۶) (بحث کی مزید تفصیل کا انتظار فرمائیں)

مرتد عورت کا حکم

جب عصمتِ دم اسلام سے ثابت ہوتی ہے تو جو شخص اسلام سے منحرف ہو جائے گا اس کا خون بھی حلال ہوگا۔ مرتد بھی ایسے ہی شخص کو کہتے ہیں لہذا مرتد کا قتل حلال ہوگا البتہ اس میں فقہاء کے متعدد اختلافات ہیں لیکن ہم سردست صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ احناف کے نزدیک مرتد عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ حبسِ دوام کی سزا دی جائے گی۔ قاضی صاحب نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے جبکہ حنابلہ اور شوافع اس کے خلاف ہیں اور وہ مرد و عورت کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

انه لا فرق بین الرجال والنساء فی وجوب القتل وروی ذلک عن ابی بکر و علی رضی الله عنهما وبه قال الحسن والزهری والنخعی ومکحول وحماد ومالک واللیث والاوزاعی والشافعی واسحاق۔ (مغنی ج۸ ص۱۰۲)

محترم قارئین! اگر آپ کو یاد ہے تو ہم پہلے بھی ایک دو مرتبہ اشارہ کر چکے ہیں کہ احناف نے ابطالِ حدود کے لئے ایک شق یہ بھی نکالی ہے کہ عورت کو مرد کے مساوی نہ سمجھا جائے' بالخصوص حدود میں' حالانکہ خواہ سرقہ ہو یا زنا، ارتداد ہو یا قتل۔ تمام میں مرد اور عورت کا یکساں حکم ہے تو اس موقع پر تفریق خلافِ اصول ہے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ:

"ولؤید ٭ اشتراك الرجال والنساء فی الحدود کلها الزنا والسرقة وشرب الخمر والقذف وصور الزنا۔" (نیل الاوطار ج۷ ص۱۹۳)

لیکن نہ معلوم قاضی صاحب کی نظر سے وہ دلائل کیوں اوجھل ہو گئے جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مرتد عورت کا بھی وہی حکم ہے جو مرتد مرد کا۔ احناف نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "لا تقتلوا امراة ولا ولیدا"۔ یعنی "عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کیا جائے"۔ وا اسفاہ کہ علمِ حدیث سے ذرا لگاؤ رکھنے والا طالب علم بھی سمجھتا ہے کہ یہ حدیث احناف کی دلیل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا محمل یہ نہیں تو ایک "قاضی"، نہ سمجھے تو ہمیں — "اذا کان الغراب دلیل قوم — سیهدیهم طریق الهالکین" — یاد آتا ہے کہ جناب اس حدیث کا تو پسِ منظر ہی اور ہے۔ بالخصوص ایسی صورت کہ جب عورت جنگ میں عملی طور پر شریک نہ ہو۔ جیسا کہ علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں: وحمل الجمهور النهی علی الکافرة الاصلیة اذا لم تباشر القتال" (نیل ج۷ ص۱۹۳)

یعنی نہی کی تخصیص اور اصل کافرہ سے تشبیہ بھی درست نہیں۔ اس کے علاوہ احناف نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "من بدل" میں من شرطیہ ہے جو کہ مؤنث کی عمومیت کا متحمل نہیں حالانکہ یہ بھی اصول سے عدم واقفیت کا مظہر ہے اور یہ مذکر و مؤنث کے شمول کی صلاحیت رکھتا ہے جیسا کہ متعدد امثلہ سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں" ومن یصلح للذکر والانثی"۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری فرماتے ہیں:۔

وهو قول الجمهور وهو الاصح الموافق لحديث الباب فان لفظ من فی قوله من بدل دينه شامل للرجل والمرأة" (تحفه ص۳۳۷ ج ۲)

بہر حال اس کے علاوہ بھی متعدد احادیث و آثار ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح مرتد ہونے پر قتل کیا جائے گا۔ مثلاً:۔

۱۔ عن جابرؓ قال ارتدت امرأة عن الاسلام فامر رسول الله صلی الله علیه وسلم ان يعرض عليها الاسلام والا قتلت فعرضوا عليها الاسلام فابت الا ان تقتل فقتلت۔

(یہ روایت متعدد اسناد سے مختلف کتب حدیث میں منقول ہے مثلاً بیہقی دارقطنی وغیرہ)

۲۔ ان امرأة سبّت النبی صلی الله علیه وسلم فقتلها خالد بن ولید۔ (بیہقی، ص۲۰۳ ج ۸)

۳۔ عن ابی مالك ان ابا بكر صديق رضی الله عنه قتل امرأة يقال لها ام قرفة فی الردة (ایضاً)

اسی اثر کے متعلق امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

"روى بعضهم عن ابی بكر الصديق رضی الله عنه انه قتل نسوة ارتددن عن الاسلام فكيف لم يصر اليه" (ایضاً)

اس کے علاوہ درج ذیل حدیث بھی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ عورت و مرد جو بھی مرتد ہو جائے اسے قتل کیا جائے گا۔

۴۔ "لا يحل دم امرئ مسلم الا باحدی ثلاث كفر بعد ايمان"۔ الحدیث

اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ "فهم كل من كفر بعد ايمانه وهو اصح"۔ (قرطبی ص۴۸ ج ۳)

عقلی دلیل

نقلاً آپ دیکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ بات ثابت ہے کہ مرتد عورت کی بھی وہی سزا ہے جو مرتد مرد کی اس کے علاوہ عقل سلیم بھی اس بات سے ابا کرتی ہے کہ مرد و زن میں فرق کیا جائے۔ کیونکہ جس طرح

مرد مکلف ہے۔ اسی طرح عورت مکلف ہے جب ان دونوں کے مکلف ہونے میں کوئی فرق نہیں تو نتائج تکلیف میں فرق کیونکر ہو؟ اس بات کی طرف علامہ ابن قدامہ نے بایں الفاظ اشارہ فرمایا ہے کہ:

"ولانها شخص مکلف بدل دین الحق بالباطل فیقتل کالرجل۔

اس کے علاوہ بھی اگر تشریح اسلامی کے محاسن کو بنظر غائر دیکھا جائے تو انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ عورت پر مرد کے احکام کو بھی جاری ہونا چاہیئے (کما لا یخفی علی العاقل) اور پھر جو وجہ تفریق بتائی گئی ہے وہ اس قدر سطحی ہے کہ جس کا تصور کم از کم اس دور میں تو وہی شخص کر سکتا ہے جو مرفوع القلم ہو کیونکہ عورت بھی فساد میں مرد سے کسی طرح کم نہیں۔ بالخصوص ایسی کمی ہرگز نہیں کہ اس سے حدود کو معطل کر دیا جائے بلکہ فساد فی الارض کا تحقق عورت سے بھی عین اسی طرح ممکن ہے جس طرح مرد سے۔

حالتِ زنا میں قتل قاضی صاحب نے فقہ حنفی کے واسطہ سے فرمایا ہے کہ زنا کرنے کی حالت میں زانی کو قتل کرنا موجب قصاص نہ ہوگا۔ احناف کے ساتھ اس مسئلہ میں حنابلہ بھی شریک ہیں یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب نے استدلال کے لئے مغنی کی طرف رجوع کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے۔ علامہ ابن قدامہ اس واقعہ کو نقل کرنے سے قبل فرماتے ہیں:

"واذا وجد رجلا یزنی بامراتہ فقتلہ فلا قصاص علیہ ولا دیۃ لما روی ان عمر رضی اللہ عنہ" الخ۔ (مغنی صفحہ ۳۵۳ ج ۱۰)

حالانکہ یہ واقعہ باعتبار سند اس قابل نہیں کہ اسے مستدل ٹھہرایا جائے کیونکہ اس کی سند هشیم عن مغیرة عن ابراهیم" ہے اور اس میں ہشیم مدلس ہے امام عجلی فرماتے ہیں "ثقة وکان یدلس" اور امام خلیلی کہتے ہیں "حافظ متقن تغیر بآخر موته" ابن سعد کا قول ہے "کان ثقة کثیر الحدیث ثبتا یدلس کثیرا فما قال فی حدیثه انا فهو حجة وما لم یقل فلیس بشئی" (تہذیب صد ۶۳ ج ۱۱) یعنی جب وہ خود سماع کی تصریح بالفاظ اخبرنا کرے تو قبول ورنہ مردود چنانچہ مندرجہ بالا واقعہ کی سند آپ دیکھ رہے ہیں کہ "هشیم عن مغیرة" یعنی معنعن ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت قابل قبول نہیں — یہی نہیں بلکہ امام حاکم نے تصریح فرمائی ہے کہ ہشیم کا سماع مغیرہ سے درست نہیں۔ چنانچہ انہوں نے تفصیل ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "ان اصحاب هشیم اتفقوا علی ان لا یاخذ واعنه تدلیسا ففطن لذلك فجعل یقول فی کل حدیث یذکرہ حدثنا حصین ومغیرة فلما فرغ قال هل دلست لکم الیوم قالوا لا قال لم اسمع من مغیرة مما ذکرت حرفا انما قلت حدثنی حصین وهو مسموع لی واما مغیرة فغیر

مسموع لی " (تہذیب ص۶۲ ج ۱۱)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغیرہ کے متعلق اگر ہشیم ثنا، انا بھی کہے تو روایت قابلِ قبول نہ ہو گی تو معنعن کا کیا حال ہو گا — چنانچہ جب ایک راوی اس قدر ذخیرۂ حدیث میں ردو بدل اور تحریف و تکذیب کا عادی اور ماہر ہو تو اس کی روایت کو قبول کرنا سراسر ہٹ دھرمی ہی نہیں بلکہ اصولِ حدیث سے جہالت و ضلالت کا بھی مظہر ہے۔

اور ہشیم کے ابراہیم سے عدم سماع پر ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ ہشیم تقریباً ۱۰۴ھ میں پیدا ہوتا ہے جبکہ اس کا مذکور استاذ ابراہیم بکثرت روایت ۱۰۴ ہجری میں وفات پاتا ہے تو قاضی صاحب بتائیں کہ کیا ایسی صورت میں سماع ممکن ہے ؟ بینوا توجروا — یہی نہیں بلکہ دوسرا واسطہ یعنی "مغیرہ عن ابراهیم" کا واسطہ بھی اس قابل نہیں کہ اس سے احتجاج ہو سکے۔ کیونکہ مغیرہ بھی مدلس ہے۔ جیسا کہ اصحابِ فن

"حدیث مغیرۃ مدخول عامتہ ماروی عن ابراهیم ان سمعہ من حماد ومن یزید بن الولید والحارث العکلی وعبیدۃ وغیرهم قال وجعل یضعف حدیث مغیرۃ عن ابراهیم وحدہ" (تہذیب ص۲۷۰، ج ۱۰)

یعنی بالخصوص جب مغیرہ ابراہیم سے منفرد ہو تو روایت قابلِ قبول نہیں۔ اب قاضی صاحب یا ان کے ہم مشرب مغیرہ کی مصاحبت و متابعت تلاش فرمائیں اور ہم بھی ان کے اس تتبع پر مشکور ہوں گے — لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

اس کے علاوہ اسماعیل قاضی فرماتے ہیں کہ "لیس بقوی فیمن لقی لانہ یدلس فکیف اذا ارسل" چنانچہ ابراہیم سے اس کی ملاقات بھی محلِ نظر معلوم ہوتی ہے۔ ابن فضیل فرماتے ہیں "کان یدلس وکنا لا نکتب عنہ الا ما قال حدثنا ابراهیم" (تہذیب ص ۲۶۹، ج ۱۰)

لیکن یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ روایت معنعن ہے۔ لہذا بایں واسطہ بھی یہ روایت قابلِ قبول نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ اصولِ حدیث کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ ابراہیم نخعی کی تقریباً کسی صحابی سے بھی ملاقات نہیں البتہ بعض ائمہ نے ان کے ارسال کی تصحیح فرمائی ہے۔ لیکن علامہ بیہقی کے بقول مبنی بر صحت ارسال صرف حضرت ابن مسعودؓ کے ساتھ خاص ہے۔ (ملخص من التہذیب)

قارئینِ عظام ہماری ان گذارشات سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس واقعہ کی اسنادی حیثیت کیا ہے ؟ تو آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ محض اس واقعہ کی بناء پر کسی قاتل کا تحفظ اور بے جا خون کروانا کس حد تک اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے ؟ بالخصوص جبکہ نبی علیہ السلام کا واضح ارشاد ہے کہ اگر کوئی

شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو بحالتِ زنا دیکھے تو قتل نہ کرے جیسا کہ حضرت سعدؓ اور آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے۔ جس کے الفاظ ہیں:

"ان سعد اقال یارسول اللہؐ أرأیت ان وجدت مع امرأتی رجلا امھلہ حتیٰ اتی باربعۃ شھداء فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعم (مسلم ص۴۹۱ ج۱، کتاب الام ص۲۶ ج۶)

اور دوسری جگہ الفاظ ہیں "یارسول اللہ ارایت الرجل یجد مع امراتہ رجلا ایقتلہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا"۔ الخ ۔ (ایضاً)

یعنی جب تک چار گواہ نہ پیش کیے جائیں اس وقت تک اس پر حد قائم نہیں ہو سکتی۔ تو اسے قتل کیونکر کیا جا سکتا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی جب اس قسم کے واقعہ کے متعلق فتویٰ لیا گیا تو آپ نے فرمایا "ان لم یات باربعۃ شھداء فلیعط برمتہ"..... "ان جاء باربعۃ شھداء والا فلیعط برمتہ"۔ (الام ص۲۶، ج۷؛ مغنی ص۳۵۳ ج۱۰)

امام شافعیؒ اپنے موقف یعنی "قصاص ہوگا" پر دلائل دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"ولھذا نقول فاذا وجد الرجل مع امراتہ رجلا فادعی انہ ینال منھا ما یوجب الحد وھما ثیبان معا فقتلھما او احدھما لم یصدق وکان علیہ القود ایھما قتل الا ان یشاء اولیاءہ اخذ الدیۃ او العفو"۔ (کتاب الام ص۲۶ ج۶)

اس کے علاوہ قانون اور آئین کے احترام کا بھی یہی تقاضا ہے ورنہ اگر ہر شخص قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا تو معاشرہ سلجھنے کی بجائے مزید بگڑے گا اور تشریعِ اسلامی کے محاسن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ایسے امور سر انجام دینے کے لئے مرکز اور اولو الامر کا انتخاب کیا اور وہ مامور ہیں۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ "لا خلاف ان القصاص فی القتل لا یقیمہ الا اولو الامر فرض علیھم النھوض بالقصاص واقامۃ الحدود وغیر ذلک" (قرطبی ص۲۴۵ ج۲)

علامہ الجزیری فرماتے ہیں: "لا خلاف بین الائمۃ فی ان القصاص فی القتل لا یقیمہ الا اولو الامر الذین فرض علیھم النھوض بالقصاص واقامۃ الحدود وغیر ذلک لان اللہ سبحانہ وتعالیٰ خاطب جمیع المومنین بالقصاص قال تعالیٰ "یایھا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ" ثم لا یتھیا للمومنین جمیعاً ان یجتمعوا علی القصاص فاقاموا السلطان مقام انفسھم فی اقامۃ القصاص وغیرہ من الحدود" (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج۵ ص۲۴۹)

اور رعایا کو بھی اس بات کا مکلف ٹھہرایا ہے کہ وہ ان کی اطاعت کریں اور اپنے معاملات میں

انہیں حاکم مجاز تصور کریں۔ علاوہ ازیں اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا بلکہ وہ بداخلاقی و بدتہذیبی، غنڈہ گردی اور قتل و غارت نیز فساد فی الارض بپا ہوگا کہ الامان والحفیظ! اس کے علاوہ شبہات پر احکام کے محل تعمیر کرنے والے نہ معلوم یہ کیونکر بھول گئے کہ کیا ان کا اختلاط واقعی مطلوب فی الحدود اختلاط ہوا ہے یا نہیں۔ جبکہ بعض حلالیوں کے نزدیک حلالہ کی صحت پر عینی شہادت ضروری ہے۔ پھر یہ بھی کیسے معلوم ہوا کہ وہ دونوں شیب ہیں یا نہیں؟ اس کے علاوہ قتل کی بجائے شریعت نے جو رجم کی سزا مقرر کی ہے۔ وہ بھی یقیناً کسی فلسفہ و حکمت سے خالی نہیں جو کہ مذکورہ صورت میں ہرگز نہیں ہو سکتی۔

عجوبہ یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ "لا مشاحۃ فی الاصطلاح" لیکن یہ بھی آپ کے ذہن میں ہونا چاہیے کہ اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ "علیہ السلام" کی اصطلاح جس طرح انبیاء علیہم السلام کے لئے خاص ہے ویسے ہی رضی اللہ عنہم کی اصطلاح صحابہ کرام کے لئے خاص ہے جبکہ رحمۃ اللہ تعالیٰ بعد والوں کے لئے عام ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بعض بدباطنوں نے اپنے عقیدے کو غیر شعوری طور پر ترویج دینے کے لئے علیہ السلام کی اصطلاح کو اپنے ائمہ کے ساتھ لکھنا علامت قطعی قرار دیا۔(۱) تو دوسری طرف بعض فرقہائے غالیہ نے اپنے اسلاف کو صحابہ کرام کی اصطلاح کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا۔ اس اصطلاحی بحث کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو قاضی صاحب نے بھی اپنی تحریر میں قارئین کے لئے لطیفہ اور علم دوست حضرات کے لئے عجوبہ چھوڑا ہے کہ ایک قاضی (واہ مولا تیرے رنگ) ایک ایسے راوی پر صحابہ کی اصطلاح کا اطلاق کر رہا ہے۔ جس کا حال ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں۔ ہمیں اعتراض یا ہمارا رونا اس بات پر نہیں کہ انہوں نے مغیرہ کو رضی اللہ عنہ کیوں کہہ دیا۔ بلکہ ہم اشکبار تو اس پر ہیں کہ انہیں یہ علم ہی نہیں کہ مذکورہ مغیرہ صحابی ہے یا کون؟ غالباً انہوں نے مغنی کو اچھی طرح دیکھا نہیں یا پھر تجاہل عارفانہ کیجئے یا تقلیدی جمود کہ مکھی پر مکھی مار دی ورنہ اگر تھوڑی سی تکلیف فرماتے تو رضی اللہ عنہ لکھنے کا تکلف نہ فرماتے۔ بہرحال یہ کوئی پہلا موقعہ نہیں بلکہ آپ ان کی کم علمی و بے بضاعتی اور فنی یتامت کا پہلے بھی مشاہدہ کر چکے ہیں اور ؂

ابھی تو ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

قولہ "اگر کسی شخص نے دوسرے کو تیر مارا اگر تیر لگنے سے قبل وہ مرتد ہو گیا پھر اس کا تیر لگا اور وہ مر گیا تو قاتل پر قصاص نہیں ہوگا۔" (ملخص تشریح ہے)

اقول محترم قارئین اس سے قبل ہم متعدد بار یہ عرض کر چکے ہیں کہ فقہ حنفی میں بعض ایسی باتیں بھی (بلکہ اکثر) ہیں جو یقیناً "محال عادی" ہیں۔ یعنی خواہ مخواہ کے مسائل کہ اگر ایسے ہو جائے ویسے

ہو جائے تو یوں ہوگا، وہ یوں ہوگا۔ حالانکہ شریعت نے ہمیں ایسی ذہنی کاوش کا مکلف نہیں ٹھہرایا بلکہ فرمایا۔ "لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسوءکم" اور نبی علیہ السلام نے فرمایا تمام سے شقی وہ شخص ہے۔ جس کے سوال کی وجہ سے کسی دوسرے مسلمان کو مشکل پیش آئے۔ آپ مذکورہ صورت ہی کو دیکھ لیجئے کہ نہ معلوم ادرءوا الحدود بالشبہات کا سہارا لے کر قاتل وسارق و زانی وغیرہ کا تحفظ کرنے والے کن بھول بھلیوں میں مصروف ہیں یہی نہیں بلکہ تشریح نمبر ۱ بھی ایسی ہی موشگافیوں پر مبنی ہے۔ حالانکہ صاف بات ہے کہ مقتول اگر اپنی چند ساعتی مستعار زندگی میں قاتل کو معاف کر دے خواہ کسی طرح بھی ہو تو قصاص ساقط ہوگا بشرطیکہ اس پر دباؤ نہ ہو یا وہ وارثوں کی ضد پر مبنی معافی نہ ہو (حالانکہ ان کا ذکر قاضی نے بالکل نہیں فرمایا) لیکن اگر مگر ویسے جیسے یہ وہ اور یوں توں تو فقہی اٹکل پچو ہیں لہٰذا ہم ان حشویات سے قطع نظر اصول تا کی طرف آتے ہیں جو اس شمارہ میں ذکر کی گئی ہے:۔

بیٹے کے بدلے باپ کا قتل اس قسط میں قاضی صاحب نے جو اہم مسئلہ ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ کیا بیٹے کے بدلے باپ کو قتل کیا جائے گا یا نہیں، اسی طرح دادا، دادی، نانا، نانی اور والدہ کا مسئلہ ہے قاضی صاحب چونکہ فقہ حنفی کو (ARTICALES) کے تحت ترتیب دے رہے ہیں تو انہوں نے یہی لکھا ہے کہ قصاص ساقط ہو جائے گا اور امام شافعی، امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے البتہ امام مالک کا خیال ہے کہ بیٹے کے بدلے باپ سے بھی قصاص لیا جائے گا ابن المنذر فرماتے ہیں کہ:

"اختلف اهل العلم فی الرجل یقتل ابنه عمدا فقالت طائفة لا قود علیه وعلیه دیة وهذا قول الشافعی واحمد واسحاق واصحاب الرای وروی ذلك عن عطاء ومجاهد وقال مالك وابن نافع وابن عبد الحكم یقتل به وقال ابن المنذر وبهذا نقول لظاهر الكتاب والسنة۔ (تفسیر قرطبی ص۲۵ ج ۲)

اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ جن دلائل کو قاضی صاحب نے فقہ حنفی کی تائید میں پیش کیا ہے وہ اسنادی قوت سے اس قدر محروم ہیں کہ انہیں کسی مسئلہ میں بھی مستدل نہیں بنایا جا سکتا چہ جائیکہ اتنے اہم مسئلہ کا مدار بنا لیا جائے۔ مثلاً پہلے حضرت عمرؓ سے (۱) یہ حدیث نقل فرمائی کہ "لا یقتل والد بولد" یہ حدیث بالفاظ مختلفہ ترمذی بیہقی اور دار قطنی وغیرہ میں بھی آتی ہے اور اس کی اسناد میں حجاج بن ارطاۃ، اسماعیل بن مسلم اور ابو تمام جیسے ضعیف اور متکلم فیہ راوی ہیں، امام ترمذی فرماتے ہیں:

"هذا الحدیث لا نعرفه بهذا الاسناد مرفوعا الا من حدیث اسماعیل بن مسلم، اسماعیل بن مسلم المكی تكلم فیه بعض اهل العلم من قبل حفظه (ترمذی مع التحفه ص۳۰۲ ج۲)

علامہ مبارک پوری فرماتے ہیں " قال عبد الحق ھذہ الاحادیث کلھا معلولۃ لا یصح منھا شیئ " ایسی ہی ایک اور حدیث کے متعلق امام ترمذی فرماتے ہیں :

" ھذا حدیث لا نعرفہ من حدیث سراقۃ الا من ھذا الوجہ ولیس اسنادہ صحیح رواہ اسماعیل ابن عیاش عن المثنی بن الصباح والمثنی یضعف فی الحدیث " (قرطبی ج ۵ ص ۲۴۹)

اس کے علاوہ عمرو بن شعیب کی حدیث ضعیف ہونے کے علاوہ مضطرب بھی ہے۔ بنابریں یہ کہنا بے جا نہیں کہ یہ حدیث بہر طریق ضعیف اور ناقابلِ احتجاج ہے انہی الفاظ سے غالباً ایک اور حدیث بھی ہے جو ابن عباسؓ سے ہے علامہ قرطبی اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ " وھو حدیث باطل " (قرطبی ج ۲ ص ۲۵)

۲- اس کے علاوہ یہ حدیث بھی پیش کی گئی ہے کہ " انت ومالک لابیک "۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک اور حدیث بایں الفاظ قاضی صاحب نے تحریر فرمائی ہے کہ " ان اطیب ما اکل الرجل " یہ حدیث علیحدہ لکھی ہے حالانکہ یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی حدیث ہیں جیسا کہ مسند احمد ص ۱۷۹، ۲۱۴، ۲۰۴، ۲۰۷ سے واضح ہوتا ہے۔ بہرحال اس کو توحسبِ معمول قاضی صاحب کی لغزش کہیئے یا لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ناکام کوشش یا کوئی دجل وفریب کا نام دے لیجیئے ہمارا مطلب تو یہ ہے کہ اس حدیث سے استدلال کرنا بالکل ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مترادف ہے کیونکہ اس حدیث کا محمل یہ نہیں بلکہ خود حدیث کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ اس کا مفہوم بزبانِ رسالتؐ متعین ہے جو کسی بھی صاحبِ علم پر مخفی نہیں اور کتبِ حدیث سے معمولی دلچسپی رکھنے والا طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس موقعہ پر نبی علیہ السلام کیا بتانا چاہتے ہیں لیکن نہ معلوم درایت کو روایت پر ترجیح دینے والوں کا خزانہ درایت ایسے مواقع پر کیوں ہڑپ ہو جاتا ہے بہرحال اہلِ علم کے سامنے اس حدیث کا محمل محتاجِ وضاحت نہیں تاہم جب راقم الحروف نے اس کے متعلق استاذ المکرم فقیہ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہٗ مدظلہ العالی سے دریافت کیا تو انہوں نے تفصیلاً روشنی ڈالنے کے بعد تمثیلاً فرمایا کہ ایک مرتبہ سید داؤد غزنویؒ اپنے دفتر میں تھے کہ عمر فاروق غزنوی آئے ان کے پاس تقریباً دو ہزار ...... کا چیک تھا وہ کمرہ میں گر گیا اور وہ چلے گئے پیچھے سے سید صاحب نے وہ چیک اٹھا لیا جب عمر فاروقؒ واپس آئے اور چیک کے متعلق دریافت کیا تو مولانا سید داؤدؒ صاحب نے برجستہ طور پر فرمایا " انت ومالک لابیک " یعنی اس حدیث کا محمل کچھ اور ہے وہ نہیں جو قاضی صاحب یا ان کے ہم مکتب حضرات نے سمجھا ہے۔ مزید تعجب ہے کہ ایک طرف قاضی صاحب اسے جزئیہ وغیرہ کی بنا پر بڑی شدومد سے مساقطِ قصاص قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف مال ہونے کی وجہ سے شبہ کہہ کر گزر جاتے ہیں تو بھائی یہ شبہ کیسا ؟

۴۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب نے اطاعتِ والدین کی آیاتِ قرآنیہ سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ استدلال بھی اس قدر سطحی ہے کہ کسی طالبِ علم کی شایانِ شان بھی نہیں کہ وہ ان آیات سے استدلال کرے اور ہمیں خود شرم محسوس ہوتی ہے کہ اس پر کتنے اور کیسے ورق سیاہ کریں — کہ کہاں حقوق اللہ اور کہاں حقوق العباد — اور اگر محض احترام ہی کی بات ہے تو پھر عورت کو خاوند کے احترام کا کوئی کم پابند کیا گیا ہے حالانکہ اس کے قصاص پر سبھی قائل ہیں۔

فخرالاسلام شاشی ... وغیرہ نے اس کی تائید میں یہ بات بھی کہی ہے کہ باپ چونکہ بیٹے کے وجود کا سبب ہے اس لئے بیٹا باپ کے عدم کا سبب نہیں بن سکتا۔ حالانکہ یہ بات بھی اسی طرح غلط اور مضحکہ خیز ہے جیسا کہ اطاعتِ والدین والی کیونکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر ایسے باپ کے متعلق کیا حکم ہے جو اپنی لڑکی کے ساتھ زنا کرتا ہے کہ اسے رجم کیا جائیگا یا نہیں؟ جب اس موقع پر اس کے عدم کا سبب بن سکتی ہے (جیسا کہ ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ ایسے باپ کو رجم کیا جائے گا) تو قتل میں کونسا مانع اور کونسی فقہ ہے جو اس بات کے حائل ہے کہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کرنے والا اور حدود اللہ کو پھلانگنے والے کے لئے بیٹا سبب عدم نہیں بن سکتا۔ (ملخصاً قرطبی صہ ۲۵ ج ۲)

یہی نہیں بلکہ اس کے برعکس ظاہر قرآن وسنت بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ بیٹے کے بدلے باپ کو بھی قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ علامہ قرطبی نے ابن المنذر سے نقل فرمایا ہے کہ :

"فاما ظاهر الكتاب فقوله تعالىٰ كتب عليكم القصاص فى القتلى الحر بالحر والعبد بالعبد" والثابت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم المومنون تتكافؤ دماءهم ولا نعلم خبرا ثابتا يجب به استثناء الاب من جملة الاية وقد روينا فيه اخبارا غير ثابتة" (قرطبی صہ ۲۵ ج ۲) اس کے بعد علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ :- "وحكى الكيا الطبرى عن عثمان ... انه يقتل الوالد بولده للعمومات فى القصاص"۔ (ایضاً)

اب ان عمومات کی تخصیص خبرِ احاد سے ہم تو کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ صحیح ہوں لیکن احناف کے نزدیک تو وہ بھی نہیں بالخصوص یہاں تو خبرِ واحد بھی ضعیف ہے البتہ امام مالک کے متعلق امام قرطبی کا یہ کہنا کہ انہوں نے عموماتِ قصاص پر اس وجہ سے عمل کیا ہے کہ وہ خبرِ احاد کو عموماتِ قرآن کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کرتے محلِ نظر ہے کیونکہ خبرِ احاد کے سلسلہ میں امام مالک کا وہ نظریہ ہرگز نہیں جو احناف کا ہے چنانچہ ہم تفصیل سے قطع نظر اجمالاً بتائیں گے کہ امام مالک کا مسلک کیا ہے چنانچہ کشف الاسرار جہ ۲ صہ ۶۹۷ پر القواطع سے ہے کہ :

وحکی جماعۃ عن مالک ان خبر الواحد اذا خالف القیاس لا یقبل، (وھذا القول) باطل سقیم عظیم وان اجل

منزلتہ مالک عن مثل ھذا القول ولایدری ثبوتہ منہ"

امام ابن قیم اس سلسلہ میں امام مالک کی تنصیص نقل فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"فممن نص علی ان الخبر الواحد یفید العلم مالک والشافعی" الخ (الصواعق المرسلۃ ج ۲ ص ۳۶۲)

بلکہ فقہاء مالکیہ کے مشہور امام ابن خواز منداد اپنی کتاب اصولِ فقہ میں ان روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے، جن میں صرف ایک یا دو راوی ہیں، فرماتے ہیں:

"ویقع بھذا الضرب ایضا العلم الضروری نص علی ذلک مالک" (ایضاً)

اس کے علاوہ خود فقہاء مالکیہ نے بھی اس کی تردید کی ہے اور اسے اہلِ زیغ کا قول قرار دیا ہے مثلاً ابوعمر ابن عبدالبر مالکی ۴۶۳ھ فرماتے ہیں:

"وقد امر اللہ عزوجل بطاعتہ واتباعہ وامطلقا لم یقید بشیئ کما امرنا باتباع کتاب اللہ ولم یقل وافق کتاب اللہ کما قال اھل الزیغ" (جامع بیان العلم ص ۱۹۰ ج ۲)

بہرحال امام مالک کے متعلق ان تصریحات کے بعد یہ کہنا کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں کہ وہ خبرِ احاد کی حجیت کے قائل نہ تھے بلکہ متعدد امثلہ بھی پیش کی جا سکتی ہیں، جن سے اس دعویٰ کی تردید ہوتی ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ادارہ علوم اثریہ کی کتاب "خبر احاد کی حجیت" جو کہ ابھی تشنہ مطباعت ہے اور ایسے ایک درجن سے زائد اہم مقالات اہلِ ثروت کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

عود الی المقصود

بہرکیف ہم دور چلے گئے بات چل رہی تھی کہ کیا بیٹے کے بدلے باپ کو قتل کیا جائیگا یا نہیں؟ آپ نقلی طور پر یعنی کتاب وسنت اور آثار کو دیکھ چکے ہیں کہ دلائل کی رو سے امام مالک کا مسلک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ باپ سے بھی قصاص لیا جائے گا۔ اس کا علاوہ عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کیونکہ کتنے شقی القلب باپ ایسے ہیں جو کہ معمولی سی بات پر اپنی اولاد کو قتل کر دیتے ہیں اور "واذا الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت" بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے اور کتنی شقی القلب مائیں ہیں جو شادی کے شوق میں اولاد کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں اور باپ بھی اپنی اولاد کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتے ہیں تو ایسے میں کیا وجہ ہے کہ ان مظلوموں کا بدلہ نہ لیا جائے اور ان ظالموں پر حدود اللہ کا اجراء نہ ہو؟ اور کیا ایسے ذمی باپ کو قصاصاً قتل کیا جائے گا جو اپنے مسلمان بیٹے کو قتل کر دیتا ہے؟

(جاری ہے)

دفاع عن الاسلام

ڈاکٹر سید ناھد علی واسطی

ازواجِ مطہراتؓ اور مستشرقین

یورپی مستشرقین نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج مطہرات پر بہت سے اعتراض کئے ہیں۔ اور اب بھی بعض مکتب فکر کے لوگ جو حقیقت حال سے ناواقف ہوتے ہیں۔ واقعات کا دیانت دارانہ جائزہ لئے بغیر رحمۃ اللعالمینؐ کی عظمت و منصب کا لحاظ رکھے بغیر اشارتاً یا کنایتاً ایسے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ از روئے انصاف و عقل بہتر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کے ہر ایک پہلو کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

اگر بفرض محال مستشرقین کے اعتراضات کو درست تسلیم کر لیا جائے، تو بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ جن قوانین فطرت کا اطلاق عوام پر ہوتا ہے بعض دفعہ مرضی باری تعالیٰ سے انبیاء کرام ان قوانین و قواعد سے مستثنیٰ پاتے جاتے ہیں۔ ہم آپ کو اصولِ فطرت سے ذرا ہٹا کر ایک بزرگ نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش کرتے ہیں، جن کی ولادت تو دائرہ قدرت کے اختیار میں تھی مگر اصول قدرت کے مطابق نہیں تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد لوگ حضرت مریمؑ کے پاس آئے اور بچہ کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ کیا ہے"؟ بجائے اس کے کہ ان کی والدہ جواب دیتیں بچہ نے کہا "میں خدا کا بندہ ہوں"۔ اگرچہ یہودیوں نے اس خلافِ فطرت بچہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصی عظمت سے یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طبعی طبیعت اور فطری قواعد و ضوابط کو بدل دیا۔ اور اس قسم کی تبدیلی پر اللہ تعالیٰ پوری طرح قادر ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ عیسائی مبلغین حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تو لوگوں سے کہتے ہیں کہ قانون کائنات کی تبدیلی پر یقین لے آؤ۔ لیکن خرق عادت کے اس سے کم تر عجیب واقعات جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہیں ان پر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اکابرین سے ایسے واقعات کا ظہور ممکن ہے۔ جو رسوم اجتماع اور قوانین طبعی کے خلاف ہیں۔

(محمد حسین ہیکل، سیرت الرسولؐ - ۳۹۴)

ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں، اس وقت عرب قوم میں کیا رواج تھا

یہ تو واضح ہے کہ عربوں میں کثرتِ ازواج کو صراحتہً کبھی منع نہیں کیا گیا۔ پس تحدیدِ ازدواج کے حکم سے پیشتر کثرتِ ازواج کوئی ایسا فعل نہ تھا جس پر انبیاءِ سابقین یا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کی جا سکے۔ دلائلِ عقلی اور قرآن حکیم کے تمام احکامات سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی امر کے امتناع کے احکام صادر ہونے کے زمانہ مابعد سے علاقہ رکھتے ہیں نہ کہ اس حکم کے قبل کے زمانہ سے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد جو کام کیا گیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ایک نوزائیدہ قوم کو جو اسلامی تہذیب کے نقطۂ نظر سے خام تراشیدہ تھی، ہر شعبۂ زندگی میں تعلیم و تربیت دے کر ایک اعلیٰ درجہ کی مہذب و شائستہ اور پاکیزہ قوم بنائیں۔ اس غرض کے لئے صرف مردوں کو تربیت دینا کافی نہ تھا، بلکہ عورتوں کی تربیت بھی اتنی ہی ضروری تھی۔ اسلامیات کے اصول سکھانے پر جو لوگ مامور کئے گئے تھے۔ ان کو مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط پر پابندیاں تھیں۔ ذرائع ابلاغ کے لئے اخبار، ریڈیو، ٹی وی تو تھے ہی نہیں۔ لے دے کے عورتوں کو براہِ راست تعلیم کے لئے عورتوں کی ضرورت تھی اور اس کی واحد صورت یہی ہو سکتی تھی کہ آپ کی اپنی تربیت یافتہ اور ذمہ دار خواتین تیار کی جائیں جو صحیح خطوط پر عورتوں کو دینی تعلیم دے سکیں۔ صرف اسی مقصد کے پیشِ نظر آپ نے متعدد خواتین سے نکاح کئے۔ ان کو براہِ راست تعلیم دی۔ تاکہ وہ ان عالمانہ صلاحیتوں کے ساتھ خواتینِ عرب میں تبلیغ کا کام انجام دے سکیں۔

اس کے علاوہ اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے جاہلانہ نظامِ زندگی کو اختیار کرنے والوں سے جنگ بھی ناگزیر تھی۔ ان حالات میں دوسری تدابیر کے ساتھ ساتھ آپ کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ مختلف قبائل میں نکاح کر کے دیرینہ عداوتوں کو ختم کریں اور نئی دوستیوں کی بنا مستحکم کر سکیں۔ چنانچہ جن خواتین سے آپ نے نکاح کئے۔ ان کے انتخاب میں یہ مصلحت کم و بیش نمایاں تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے نکاح کر کے آپ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما کے ساتھ اپنے تعلقات کو مستحکم بنایا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا اس خاندان کی بیٹی تھیں جس سے ابوجہل اور خالد بن ولید کا تعلق تھا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ان شادیوں نے بڑی حد تک ان خاندانوں کی دشمنی کا زور توڑ دیا۔ اور اس نکاح کے بعد ابوسفیان کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر نہیں آئے۔ حضرت صفیہؓ، جویریہؓ اور ریحانہؓ یہودی خاندان سے تھیں، انہیں آزاد کر کے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کئے تو یہودیوں کی تخریبی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔ معاشرہ کی عملی اصلاح اور اس کی جاہلانہ

رسوم کو ختم کرنا بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں شامل تھا چنانچہ آپؐ نے حضرت زینبؓ بنت جحش سے محض اس بناء پر نکاح کیا کہ عرب میں تبنیٰ کو حقیقی بیٹا اور وراثت کا حقدار سمجھا جاتا تھا اور اس کی بیوی سے نکاح حرام تصور ہوتا تھا۔ چونکہ یہ رسم درواج حقیقت اور شرع کے خلاف تھا۔ لہٰذا آپؐ نے اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ سے طلاق یافتہ حضرت زینبؓ بنت جحش سے نکاح کرکے عملاً اس رسم کا خاتمہ کر دیا۔

حضرت میمونہؓ کی ایک بہن سردار نجد کے گھر میں تھی۔ یہ نکاح نجد میں صلح و آشتی اور اسلام پھیلانے میں بہت نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ حالانکہ اہل نجد نے ہمیشہ اسلام کے خلاف فساد برپا کیا۔ یہ مصلحتیں اس بات کی مقتضی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کارِ عظیم سپرد کیا گیا تھا۔ اس کی ضروریات کے لحاظ سے آپؐ نے اس ذریعہ امن و تبلیغ سے بھی استفادہ حاصل کیا۔

مخالفین کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چار بیویں کی اجازت ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کے پاس چار بیویوں سے زیادہ تھیں تو سورۂ نساء کے نازل ہونے کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ چار سے زیادہ اگر ہیں تو ان کو علیحدہ کر دو۔ قیس بن حارث جب مسلمان ہوئے تو ان کے پاس آٹھ بیویاں تھیں۔ غیلان الثقفی جب مسلمان ہوئے تو ان کے پاس دس بیویاں تھیں۔ جو ان کے ساتھ مسلمان ہو گئیں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ چار عورتیں چن لیں باقی چھوڑ دیں۔ مگر خود آپؐ نے چار سے زیادہ ازواج مطہرات کو علیحدہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کا وصال ہوا تو ۹ بیویاں زندہ موجود تھیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان عورتوں سے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آچکی تھیں۔ دوسروں کو نکاح کرنے سے منع فرما دیا تھا۔

"وَلَا تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا"

ترجمہ:۔ اے مسلمانو! خدا کے پیغمبرؐ کی بیویوں سے اس کے بعد نکاح مت کرو۔

یہی سبب تھا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجہ کو اپنی زوجیت سے خارج کرنا پسند نہ فرمایا۔ مگر مسلمانوں کی عورتوں سے یہ حکم متعلق نہ تھا۔ اس لیے خود تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام ازواج کو بدستور نکاح میں رکھا۔ مگر جن مسلمانوں کے پاس چار عورتوں سے زیادہ نکاح میں تھیں ان سے فرمایا کہ چار سے زیادہ ہوں تو ان کو چھوڑ دیا جائے۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے میں اگر نکاح حکماً منع نہ کیا جاتا تو اسلام میں ایک عظیم فتنہ رونما ہو سکتا تھا۔ یہ عورتیں اگر طلاق لینے کے بعد نئے خاوند کرتیں تو وہ خاوند اپنے مزاج اور مطلب

کے مطابق سینکڑوں حدیثیں اپنی بیویوں کے حوالہ سے بیان کر سکتے تھے۔ جو بالآخر فسق و فجور کا شاخسانہ بن جاتا، اور اسلامی احکامات میں اختلال و فجور کا باعث ہوتا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:۔ کے پہلے شوہر کا نام ابو ہالہ بن زرارہ تھا ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ جب ابو ہالہ مرگیا تو خدیجہ نے عتیق بن عائذ سے نکاح کر لیا۔ جو کہ قریش کے بنی مخزوم قبیلہ سے تھا۔ اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جب عتیق بھی مرگیا تو ۲۸ قبل ہجری میں حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نکاح کر لیا۔ نکاح کے وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ نکاح کے بعد آپ سے چار لڑکیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں لڑکے بھی پیدا ہوئے، مگر زندہ نہ رہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سنہ ۳ قبل ہجری میں ۶۵ سال کی عمر میں مکہ مکرمہ میں انتقال فرمایا۔ اس بات سے سب کو اتفاق ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی زندگی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا:۔ حضرت سودہؓ کے باپ کا نام زمعہ تھا اور ماں کا نام شموس بنت قیس تھا۔ ان کا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا تھا۔ اس سے ایک لڑکا عبدالرحمٰن پیدا ہوا تھا۔ حضرت سودہ اور ان کا شوہر دونوں مسلمان ہو گئے تھے۔ جب دوسری مرتبہ مسلمان ہجرت کر کے حبش گئے تھے۔ تب حضرت سودہ مع اپنے شوہر کے مکہ سے حبش چلی گئی تھیں۔ جب حبش سے واپس آئیں تو مکہ میں اُنکے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ پھر سنہ ۳ قبل ہجری میں ان کے خاوند کا جب انتقال ہوا تو حضرت سودہؓ کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵۰ سال تھی۔ اور حضرت سودہؓ بھی ۵۰ سال کی تھیں۔ اس حالت میں یہ خام خیالی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ نے یہ نکاح کسی خواہش نفسانی کے سبب سے کیا بلکہ حضرت سودہؓ مسلمان تھیں اور کفار مکہ سے تکالیف اٹھا چکی تھیں اور جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تو تنہا رہ گئی تھیں۔ پس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زوجیت میں لانا بتقاضائے انسانیت خیال فرمایا۔ آج تک کسی مورخ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے حسن و جمال کی یا مال و متاع کی تعریف نہیں کی۔ نہ ایسی کوئی شہادت ملتی ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ آں حضورؐ نے حضرت سودہؓ کو عقد کا شرف محض اس لئے بخشا تھا کہ باقی ماندہ عمر میں بالکل بے یار و مددگار نہ رہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دختر تھیں۔ ان کی ماں کا نام ام رومان زینب تھا۔ رخصتی کی رسم سنہ یکم ہجری میں ہوئی۔ یہی وہ خاتون تھیں جن کی اسلامی خون

سے ولادت اور اسلامی دودھ سے پرورش ہوئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شادی کو منجانب اللہ قرار دیا ہے۔ آپ کی پاک دامنی پر جب غزوہ انمار میں لوگوں نے شبہ پیدا کر دیا تو سورہ نور میں "الطیبات للطیبین والطیبون للطیبات" کے الفاظ آپ کے لئے اترے اور آپ کی پاکی اور طہارت کو فرشتوں نے تسلیم کیا۔ لیکن رب العالمین ہاں کے ہی مرتبے بلند فرماتا ہے جو اس کی بارگاہ میں انکسار اختیار کرتے ہیں۔ آپ کی فضیلت منصب بارگاہ الٰہی میں کس قدر تھی اس کا اندازہ حضور اکرمؐ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے "یہ عائشہ ہی ہے کہ میں اس کے لحاف میں ہوتا ہوں تو اس وقت بھی وحی کا نزول ہوتا ہے۔"

حضرت عائشہؓ کے رتبہ سے متعلق صحیحین میں یہ روایت مذکور ہے "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے کہا۔ یہ جبرائیل ہیں اور تم کو سلام کہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا ان پر اللہ کا سلام اور رحمت ہو۔"

قرآن مجید میں جب درج ذیل آیت یعنی آیت تخییر کا نزول ہوا :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ○ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ○ (الاحزاب ۲۸-۲۹)

تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت فرمایا۔ جس کے جواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فوراً یوں کہا۔ "میں تو اللہ اور رسول اور آخرت ہی کو اختیار کرتی ہوں۔"

کتب احادیث میں آپ کے ذریعہ منقول شدہ احادیث کی تعداد دو ہزار دو سو دس بتائی گئی ہے۔

<u>حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا</u> : آپ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی تھیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر کا نام خنیس ابن حذافہ تھا۔ جنہوں نے حضرت حفصہ کے ساتھ ہجرت کی اور غزوہ بدر کے بعد انتقال ہوا۔ خنیس کے انتقال کے بعد ۳ھ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقد ہوا۔ اس وقت رسول پاک کی عمر ۵۶ سال تھی۔ آپ سے رشتہ ازدواج منسلک کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے تعلقات کی بنیاد مضبوط ہو جائے۔ (اسی غرض سے آپؐ نے حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو شرف دامادی بخشا تھا) اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے عقد سے لوگوں کو یہ یقین

دلانا بھی منظور تھا کہ مسلمان سمجھ لیں کہ اگر وہ راہ خدا میں کام آگئے تو ان کے بیوی بچے سرپرستی سے محروم نہیں رہیں گے۔ حضرت حفصہ رضؓ کا انتقال ۴۵ھ میں ہوا اور آپ کی عمر ۶۳ سال تھی۔

حضرت زینب ام المساکین رضؓ: حضرت زینب رضؓ جو ایام جاہلیت میں اپنی فیاضی کی وجہ سے ام المساکین کے نام سے مشہور تھیں۔ قبیلہ بنو ہلال سے تھیں۔ آپ کے باپ کا نام خزیمہ بن حارث تھا اور والدہ کا نام ہند بن عوف تھا۔ ان کا پہلا شوہر عبداللہ بن جحش تھا جو غزوہ احد میں شہید ہو گئے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ کا نکاح رسولِ خدا سے ۳ھ میں ہوا۔ یہاں بھی وہی معاملہ تھا کہ حضور سرورِ کائناتؐ کو آپ کی سرپرستی منظور تھی۔ آپ چاہتے تھے ایک شہید کی بیوی جس کے شوہر نے خدا کے نام پر جام شہادت نوش کیا۔ وہ اس کے بعد نان نفقہ کو محتاج نہ ہو۔ اس وجہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۹ سال تھی اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵۶ سال تھی۔ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف آٹھ ماہ رہ کر انتقال فرما گئیں۔ ان کی عمر اس وقت ۳۰ سال تھی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا: آپ کا اصلی نام ہند تھا۔ ان کی والدہ عاتکہ تھی، جو قبیلہ بنو کنانہ سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر یہ عاتکہ عبدالمطلب کی بیٹی اور نبی کریم کی پھوپھی نہیں تھیں بلکہ ان کے باپ کا نام عامر تھا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے باپ ابوامیہ تھے۔ جن کا نام حذیفہ تھا اور عرب کے مشہور شہسوار تھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی تھے۔ وہ اور ان کے شوہر دونوں مسلمان ہو کر ملک حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں ان کی دو لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کا نام زینب اور درہ تھا۔ دو لڑکے پیدا ہوئے۔ جن کا نام سلمہ اور عمر تھا۔ ابوسلمہ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ ۴ھ میں وفات پائی۔ تو ام سلمہ کا نکاح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۶ سال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۶۲ سال تھی۔ جب حضورؐ نے ام سلمہ کو شادی کا پیغام بھیجا تو جواب ملا کہ میری جوانی کے دن بیت گئے ہیں اور بچے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن آپؐ نے مکرر پیغام بھیجا۔ (اور اس کی وجہ محض یہ تھی ام سلمہ ایک شہید کی بیوہ تھیں) تو حضرت ام سلمہ رضؓ راضی ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رشتہ ام سلمہؓ کے حسن و جمال کی وجہ سے نہ تھا۔ اگر عقد اس خیال سے ہوتا تو مہاجرین و انصار میں بہت سی دوشیزائیں موجود تھیں۔ آپ کسی کا بھی انتخاب فرما لیتے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ رشتہ صرف نادار بیوہ سے ہمدردی کے لئے تھا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ۶۲ھ میں وفات پائی تو ان کی عمر کچھ کم ۸۰ سال تھی۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا:۔ زینبؓ جحش کی بیٹی تھیں اور ماں کا نام امیمہ تھا۔ اور امیمہ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں اور عبداللہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد) کی بہن تھیں۔ اس رشتے سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ پہلی مرتبہ ان کا نکاح زید بن حارث سے ہوا، جب زید بن حارث نے طلاق دے دی تو نبی کریمؐ سے ان کا نکاح ۵ھ میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۵ سال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵۸ سال تھی۔ آپ کا حضور نبی کریم کے بعد انتقال ہوا۔

چونکہ اس نکاح پر مستشرقین نے بہت کچھ کہا ہے تو بہتر ہے کہ اس معاملہ کو ذرا تفصیل سے بیان کر دوں حضرت زینب ایک عالی خاندان عورت تھیں۔ ان کو پسند نہ تھا کہ ایک شخص از زید بن حارثہ (جسے اگرچہ نبی کریمؐ نے متبنّٰی بنا رکھا تھا۔ مگر کسی وقت بحیثیت غلام بھی رہا تھا) سے شادی کیجائے۔ مگر جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح پر اصرار کیا اور اس پر ایک آیت بھی نازل ہوئی جو یہ ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُولُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (الاحزاب: ۳۶)

"مسلمان مرد اور عورت کو یہ نہیں چاہیئے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ مقرر کر دیں تو پھر اس امر میں اس کو کچھ اختیار باقی رہ جائے اور جس نے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی ایک بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔"

اس وقت حضرت زینبؓ حضرت زیدؓ سے نکاح کرنے پر راضی ہو گئیں مگر طبیعت مطمئن نہ تھی اب سوچئے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنا منظور ہوتا تو زید کے ساتھ نکاح کرنے میں اس قدر اصرار کیوں فرماتے۔ بعد نکاح زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہا اور زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نہ بن سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زید زینبؓ سے عاجز آ گئے اور طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے آپ کو یہ اطلاع کر دی تھی کہ زینب کو زید طلاق دے گا اور وہ تیری زوجیت میں آجائے گی۔

وَإِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰىهُ ؕ (احزاب ۳۷)

ترجمہ :۔ اور یاد کرو جب کہا آپ نے اس شخص کے بارے میں جس پر انعام کیا اللہ نے
اور انعام کیا تو نے۔ پاس رکھ اپنی بیوی اور ڈرو اللہ سے اور تم اپنے دل میں ایک
ایسی بات چھپاتے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ
اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔"

اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر دامنگیر ہوئی کہ زید کے طلاق دینے کے بعد زینب کا کیا ہوگا۔ آخر وہ آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور زید کے ساتھ شادی بھی آپ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اب سوائے اس کے زینب کی سرپرستی کریں کیا چارہ تھا۔ مگر خوف تھا کہ عرب کیا کہیں گے کہ متبنٰی کی مطلقہ کے ساتھ شادی کر ڈالی۔ اس وقت اللہ تعالٰی کی جانب سے یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ (احزاب ۳۷)

ترجمہ :۔ پس جب فیصلہ کر چکا زید جدا کرنے کا تو ہم نے آپ کے نکاح میں دے دیا تاکہ
مومنوں کو اپنے متبنٰی کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی خلش نہ رہے۔ جب وہ
مکمل کر چکیں ضرورت اپنی۔ اور ہے اللہ کا حکم پورا ہونے والا۔

حضرت جویریہ رضی اللہ تعالٰی عنہا :۔ آپ بنت الحارث بن ابی ضرار بن حبیب بنی مصطلق قبیلہ سے تھیں۔ ۵ھ میں غزوہ مریسیع میں اسیر ہو کر آئیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شادی کیلئے قبول فرمایا۔ ان کی پہلی شادی نافع بن صفوان سے ہوئی۔ مسلمانوں نے جب اس شادی کی خبر سنی تو سب نے کہہ دیا کہ بنی مصطلق اب رسول اللہ کے قرابت دار ہیں۔ اور اب ہمیں ان سے اس کے مطابق سلوک کرنا چاہیئے۔ چنانچہ تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ ان کے بھائی عبداللہ بن حارث اور عمرو بن الحارث جو نہایت دلیر جوان تھے مسلمان ہو گئے۔ حضرت جویریہ کا انتقال سن پچاس ہجری میں ہوا۔

حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ تعالٰی عنہا :۔ آپ کا اصلی نام رملہ تھا۔ ان کے باپ کا نام ابو سفیان تھا اور ماں کا نام صفیہ تھا۔ دونوں ماں باپ بنی امیہ سے تھے۔ ام حبیبہ رضی اللہ تعالٰی عنہا کا پہلا شوہر عبداللہ بن جحش تھا۔ جو مسلمان تھا اور حبشہ اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت کو گیا تھا۔ وہاں جا کر عبداللہ تو عیسائی ہو گیا مگر حبیبہ مسلمان رہیں۔ جب عبداللہ مر گیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو کہلا بھیجا کہ ان کا نکاح ام حبیبہ سے کر دے۔ چنانچہ ۶ھ میں یہ نکاح بمقام حبشہ ہو گیا۔ اور آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نجاشی نے مہر ادا کیا۔ (علامہ حافظ ابن قیم زاد المعاد ج اول صہ ۹۳)

اس وقت ام حبیبہؓ کی عمر ۳۷ سال تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۶۰ سال تھی۔ بعد نکاح ام حبیبہؓ مدینہ آئیں اور حضورؐ کے پاس رہیں۔ ان کی وفات ۴۴ھ میں ہوئی۔ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے فضائل میں منقول ہے جیسے ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ امام اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ ام حبیبہ نے بستر لپیٹ دیا۔ ابو سفیان نے بیٹی سے کہا کیا بات ہے مجھے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتیں تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواباً کہا کہ یہ بستر رسول خدا کا ہے۔ آپ تو مشرک ہیں آپ بستر پر نہ بیٹھیں۔ (رحمۃ للعالمین۔ ج دوم صہ ۱۷۸)

حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:۔ یہ حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں۔ ان کی ماں کا نام برہ بنت سموال تھا۔ ان کا پہلا شوہر سلام بن مشکم تھا۔ دوسرا شوہر کنانہ بن ابی الحقیق تھا جو جنگ خیبر میں مارا گیا تھا۔ دحیہ کلبی کبار صحابہ میں سے تھے۔ انہوں نے صفیہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی جس پر لوگوں میں اختلاف ہو گیا اور سب نے یہی کہا کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح فرما لیں۔ حضور نبی اکرمؐ نے صفیہ کو آزاد فرمایا اور بعد میں نکاح کر لیا۔ ایک روز صفیہؓ نے شکایت کی حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا تھا کہ ہمارا نسب اونچا ہے جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے حضور نبی کریمؐ نے فرمایا کہ "تم بھی کہہ دیتیں کہ تم مجھ سے بہتر کیسے ہو گئیں۔ میرا باپ ہارونؑ ہے۔ میرا چچا موسیٰ علیہ السلام ہے اور میرا شوہر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آپ نے ۵۰ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔

حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:۔ آپ بنت الحارث بن بجیر بن مخزم بن رویبہ بن عبداللہ تھیں۔ آپ کے پہلے شوہر کا نام ابی رحم بن عبدالعزیٰ تھا۔ اس سے پیشتر حویطب بن عبدالعزیٰ کے نکاح میں تھیں۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں عمرہ فرمایا تو اس وقت ان کے شوہر وفات پا چکے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے بارے میں آنحضورؐ سے ذکر فرمایا کہ بہت پریشان حال ہیں۔ حضورؐ نے نکاح ذیقعدہ ۷ھ میں فرما لیا۔ اس وقت حضرت میمونہؓ کی عمر ۳۶ سال اور حضورؐ کی عمر ۵۹ سال تھی۔ آپ تقریباً ۳ سال حضور کریمؐ کے ساتھ رہیں اور ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی وفات ۵۱ھ میں مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ سب سے زیادہ عمر ازواج مطہرات میں آپ نے پائی۔

مستشرقین نے کثرت ازواج پر طرح طرح کے حیرت کن تبصرے کئے ہیں۔ ان سے متاثر

صاحبان اگر غور و فکر سے جائزہ لیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۶۳ سال ہوئی۔ جس میں سے پچاس سال کی عمر تک ایک عورت سے جو دو شوہروں کی مطلقہ تھی ان سے رشتہ ازدواج میں گذارے۔ جس کے انتقال کے وقت تک اور شادی نہ کی۔ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد ایک اور ضعیف اور نادار بیوہ سے شادی کی۔ ہجرت کے بعد سن ایک ہجری سے ۵ھ تک ۹ شادیاں کیں۔ جن میں سے آٹھ برائے نام تھیں۔ پس پردہ وہ اسباب تھے جن کا تذکرہ مختصراً اوپر کر چکا ہوں۔ آپ سوچئے کہ جس شخص نے زندگی کے عین عنفوان شباب کا زمانہ کمال تقوےٰ اور نہایت ورع کے ساتھ گذارا۔ جب کہ مکہ کی ایک ممتاز شخصیت عتبہ بن ربیعہ (جو کہ قبیلہ بنو عبد شمس کا سردار تھا) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کی تھی کہ مکہ کی جس دوشیزہ کو کہو اور جتنی دولت کہو دیتا ہوں مگر اس نے خدا کا ذکر بند کر دو جو تم کرتے رہتے ہو۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسالت مآب نے پیش کش رد کر دی۔ کیا کوئی شخص ایسے عظیم انسان کے لئے باطل خیال دل میں لا سکتا ہے کہ اس تزویج کی وجہ وہی تھی جو عام طور پر جوش جوانی سے منسوب کی جاتی ہے؟

اگر تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ عیش پرستی تو دور کی بات ہے آپ نے نہایت عسرت و تنگدستی کی حالت میں بے آسرا نادار عورتوں سے شادی کر کے خود کو ان کے نان و نفقہ کا کفیل بنا کر ایثارِ عظیم کا ثبوت دیا ہے۔ یقیناً اگر انسانیت کے زاویہ نگاہ سے ان کثرتِ ازدواج کے اغراض و مقاصد کا تجزیہ کیا جائے تو آپ پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے۔ اس کی بے بنیادی اور بے ثباتی اظہر من الشمس ہو جائے گی۔

مقالات

ڈاکٹر عفیفی ابراھیم حسن (عربی)
مولانا عبدالرحمان کیلانی (اردو)

اشتراکیت اور صہیونیت کے مابین فری میسن کا کردار

دس سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے جب ایک قلیل طبقہ کے متعلق مختلف پہلوؤں سے بحث و تحقیق کا آغاز ہوا۔ آج کی فرصت میں ہم اس طبقہ کے متعلق نئی، پرانی، مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے سربستہ اسرار و رموز سے پردہ اٹھائیں گے۔

اس مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ ہر صاحب عقل و فہم، تمام دنیا کی داخلی و خارجی سیاست میں "فری میسن" کے پھیلے ہوئے اثر و نفوذ اور عزائم سے آگاہ ہو سکے اور اسے معلوم ہو جائے کہ فری میسن کی خفیہ تنظیمیں اور کلبیں مثلاً لیونز کلب اور روٹری کلب اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے کس طرح کام کر رہی ہیں۔ اس مقالہ میں فری میسن کی تاریخ، آغاز، تنظیم اور اس کے اسرار اور اشتراکیت و صہیونیت سے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی جائے گی۔

میں اللہ تعالیٰ سے ہر اس شخص کے حق میں دعا مانگتا ہوں، جس کا فری میسن اور اشتراکیت کی تنظیموں اور مجالس سے کسی طرح کا بھی تعلق ہے ـــــ خواہ یہ تعلق عملاً ہو یا واقفیت کی حد تک ـــــ کہ خدا تعالیٰ اسے فری میسن کے ناپاک عزائم اور عالمی صہیونیت کے کردار کو سمجھنے اور اپنے آپ کو ان تحریکوں کے ناپاک جرائم سے دور رکھنے کی توفیق بخشے، کیونکہ یہ تحریکیں تمام دنیا کو گمراہ کن خطوط پر چلانے اور عالمی صہیونیت کے پنجۂ استبداد میں جکڑنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

اور جو شخص بھی ان تحریکوں کے ناپاک عزائم سے آگاہ ہو جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دین کی خاطر اپنے حلقۂ احباب و دائرہ میں فری میسن کے اسرار اور عالمی صہیونیت کے عزائم کی بھرپور اشاعت کرے تاکہ عوام الناس ان تحریکوں کی خباثتوں اور تباہ کاریوں سے آگاہ ہو کر ان سے بچ سکیں۔

قولِ باری تعالیٰ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ (النساء ۷۱) اے ایمان والو! اپنے بچاؤ کا سامان پاس رکھو اور ہر وقت چوکنے اور ہوشیار رہو" نیز:

"وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ (التوبۃ ۱۰۵)" اور ان سے کہہ دو کہ عمل کیے جاؤ، خدا اور اس کا رسول اور مومن تمہارے عملوں کو دیکھ لیں گے۔ پس ہر مسلمان کو اس پرچار کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اللہ ہی ہمارا کارساز ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

تعریف صہیونیت ایک یہودی تحریک ہے، جو فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام اور بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے سرگرم عمل ہے جسے وہ اپنی قومیت کا نشان سمجھتے ہیں صہیونیت یہودیوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی تنظیم ہے جس کا مرکز لندن ہے۔ ۱۸۹۶ء میں ڈاکٹر تھیوڈور ہرزل[1] کی کوشش و ہمت سے اس کا آغاز ہوا جو یہودی النسل اور امیر المنفی (انتہا پسند لیڈر) کے لقب سے مشہور تھا۔ یہی شخص صہیونیت کا بانی، اس کے انداز فکر کا موجد اور فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت قائم کرنے کا خواہاں تھا۔ صہیون صحرائے سینا میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اسی نسبت سے اس تحریک کا نام صہیونیت رکھا گیا۔ اس پہاڑ پر حضرت داؤد[2] علیہ السلام نے خواب میں ہیکل (معبد۔ یہودیوں کی عبادت گاہ) کی شکل دیکھی اور اسے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ حضرت داؤدؑ نے اپنے بیٹے سلیمان علیہ السلام کو اس معبد کی شکل اور نقشہ سے مطلع کیا اور آپؑ کی وفات کے بعد سلیمان علیہ السلام نے اس ہیکل کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کیا۔ اس معبد کے لئے لکڑی لبنان کے صنوبر کے درختوں کی استعمال کی گئی اور یہ ہیکل موریا پہاڑ پر بنایا گیا جس کا ذکر تورات میں آیا ہے۔ ہیکل سلیمان کے احاطہ میں سے ایک دیوار ۔ دیوار گریہ (البراق الاسلامی)[3] باقی ہے، جو مسجد اقصیٰ کی مغربی دیواروں میں سے

---

[1] "تھیوڈور ہرزل" وی آنا کا ایک یہودی تھا جس نے ۱۸۹۶ء میں "ریاست یہود" کے نام سے ایک رسالہ شائع کر کے صہیونیوں کے لئے قومی وطن کا ٹھوس تصور پیش کیا۔ اس نے یہودی ریاست کی حدود کوہِ یورال (ترکی) سے نہر سویز تک مقرر کیں اور یہود کو فلسطین داؤد و سلیمان کا نعرہ دینے کے علاوہ واضح طور پر صہیونی تحریک کے مقاصد متعین کر دیے۔

[2] حضرت داؤدؑ ۱۰۴۵ ق م میں پیدا ہوئے۔ ۳۰ سال کی عمر میں سلطنت ملی اور ۴۰ سال تک حکومت کی۔ ۹۷۵ ق م میں وفات پائی۔ (مترجم)

[3] البراق الاسلامی: حرم شریف کی مغربی دیوار میں پچاس فٹ کے ایک ٹکڑے کے بارے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کے باقیات میں سے ہے، چنانچہ یہودی جب اس مقام پر آتے ہیں تو گریہ و بکا کرتے ہیں اور اسی نسبت سے اس کا نام دیوار گریہ پڑ گیا ہے۔ اس مقام کو مسلمان البراق کہتے ہیں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایک دیوار ہے۔ جسے یہودی چومتے چاٹتے ہیں اور اس کے پاس گریہ وزاری کے مظاہرے کرتے ہیں۔

اشتراکیت اور بالشوزم اشتراکیت کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز سب انسانوں کے لئے مشترکہ ہے یہ ایک ایسی تنظیم ہے جو معاشرہ کے مختلف طبقات میں تخریب کاری کے ذریعہ امتیاز ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ تنظیم چونکہ اللہ تعالیٰ اور ادیان الٰہیہ کی منکر اور ملحد ہے لہذا یہ اپنی حکومت کے قیام کی خاطر دین اور وطن کسی چیز کو بھی تباہ کرنے سے گریز نہیں کرتی۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول دو ہیں۔ پہلا یہ کہ مملکت کے تمام وسائل پر قبضہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ ایک سیاسی جماعت کی حکومت (ONE PARTY GOVERNMENT) ہو۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اپنی ہی جماعت میں سے تحریک کی وفادار شخصیتوں کو حکومت میں لایا جاتا ہے۔

اشتراکیت (COMMUNISM) کے نام میں بہت بڑا فریب ہے اور لوگ اسے جنت سماوی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ تحریک یہودی انداز فکر کی مرہون منت اور بڑے بڑے یہودیوں کے افکار و اختراع کا نتیجہ ہے۔ کارل مارکس جو اس تحریک کا بانی ہے۔ صہیونیت کا سرگرم کارکن اور روسی پروفیسر اور عالم تھا۔ یہ تحریک بالشوزم (انتہاپسند انقلابی جماعت) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے کارکن عالمی صہیونیت کے مقاصد کی تکمیل کی خاطر کسی بھی علاقہ کے اجتماعی نظام۔ خواہ وہ سیاسی ہو یا دینی فکری ہو یا اقتصادی — کو زیر و زبر کرنے اور عوام الناس کو گمراہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں کارل مارکس کے علاوہ اس تحریک کے دوسرے قائدین مثلاً ٹراٹسکی، لینن اور زینوفیاف یہودی صہیونی اور روسی النسل تھے۔ جو جمہوری اشتراکیت کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنے، اور شرقی فلسطین اور غربی روم حاصل کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

فری میسن (الماسونیہ) اس تحریک کو فرانسیسی زبان میں "فرنساسوتری" اور انگریزی میں فری میسن (FREE MASON) کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی "آزاد تعمیر" بھی ہو سکتے ہیں اور "آزاد معمار" بھی۔ آزاد تعمیر سے مراد ہیکل سلیمان ہے اور آزاد معماروں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ابتداءً ہیکل سلیمان کو تعمیر کیا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

کیونکہ شب معراج سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ براق سے اترے۔ براق کو باندھا اور مسجد میں تشریف لے گئے تھے۔ اس جگہ کی نشان دہی کے لئے یہاں ایک گول کڑا لگا ہوا ہے۔

آغاز سب سے پہلے جس شخص نے یروشلم میں فری میسن کی پہلی مجلس منعقد کی وہ ہیروڈوس اغریپا تھا جو یہودی حکمران (۳۷ تا ۴۴ء) تھا اور ہیروڈوس اکبر کا پوتا تھا۔ ہیروڈوس اکبر وہ یہودی ظالم بادشاہ تھا جس نے بیت لحم کے بچوں کو محض اس خوف سے قتل کیا تھا کہ مسیح منتظر ان میں پیدا ہونے والا ہے جو اس کی حکومت کا خاتمہ کرے گا۔ (اور اس کا یہی فعل سیدہ مریمؑ اور اس کے بچے یسوع اور یسوع کے خالو یوسف النجار کے وہاں سے نکلنے کا سبب بنا۔ کیونکہ فرشتے نے مریمؑ کو حکم دیا تھا کہ وہ بچے کو لے کر مصر کی طرف چلی جائے اور اس طرح اپنی جان بچائے۔

جن لوگوں نے اس محفلِ اوّل میں ہیروڈوس سے تعاون کیا۔ ہیروڈوس نے ان سے کہا، کہ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہماری اس عظیم و پُرشکوہ جماعت کی بنیاد کی تاریخ کا لوگوں میں سے کسی کو علم نہ ہونے پائے۔ تاکہ جو لوگ اس جمعیت میں داخل ہوں انہیں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس قدیم جماعت نے کون سے زمانہ میں تشکیل پائی، اور اس کے بانی مبانی کون لوگ تھے؟ بلکہ یہ تاثر دیا جائے کہ یہ تحریک ابھی تھوڑا عرصہ پیشتر ماند پڑ گئی تھی۔ ہیروڈوس اغریپا نے اپنے باپ کے متروکہ ذخائر میں چند قدیم اوراق دیکھے جو اس "پرانی جماعت" کے قوانین و ضوابط کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ لہذا اس نے وہ اوراق نکالے اور اسی جماعت کی طرف توجہ کی۔ اور اس تاریخی بنیاد کو سربستہ راز بنانے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ایسی اہم اور بڑی جماعت میں شامل ہونے کا شوق پیدا ہو۔

تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ روم کا ظالم بادشاہ "نیرون یا نیرو بھی اسی اغریپا کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان کے دو حصے ہو گئے تھے۔ ایک فلسطین پر حکومت کرتا تھا۔ بخت نصر شاہ عراق نے شکست فاش دے کر انہیں قید کر لیا۔ ہیکل سلیمان کو تباہ کیا۔ اور بہت سے یہودی گرفتار کر کے ساتھ لے گیا۔ اس خاندان کے کچھ لوگ روم کی طرف بھاگ گئے۔ نیرو بادشاہ انہیں میں سے تھا۔ (عہدِ حکومت ۵۴ تا ۶۸ء) جس نے پولس کو قتل کر کے عیسائیت کو تہس نہس کیا، اور روم میں یہودیت کا پنجۂ استبداد گاڑ دیا۔ رومی یہودیوں نے نیرون کے عہد حکومت میں شرق و غرب میں فتنہ و فساد، لاقانونیت اور جبر و استبداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

رومی یہودیوں کا یہ فرقہ دراصل یہودی عورتوں کی ہی اولاد تھی۔ یہ لوگ اس لئے یہودی کہلاتے تھے کہ یہودی شریعت کے مطابق اولاد خواہ یہودی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف

لہ (۶۰۴ تا ۵۶۲ ق م) اس کا ذکر تورات میں بھی آیا ہے۔ (بحوالہ المنجد) (مترجم)

سے۔ وہ بہرحال یہودی ہے۔ اور ان کے نام باقاعدہ ان کے معبدوں کے ریکارڈ میں درج کئے جاتے تھے۔

فری میسن کی اقسام

فری میسن فی الحقیقت تین گروہوں میں منقسم ہے۔

(۱) عام خفیہ تنظیم۔

۲۔ شاہی فری میسن جو دنیا کے سربراہان مملکت اور بڑے لوگوں سے روابط قائم کرتی ہے۔

۳۔ فری میسن کی ظاہری سُرخ تنظیم جسے اشتراکیت کہتے ہیں۔

عام خفیہ تنظیم

جسے عموماً قرمزی تنظیم کہا جاتا ہے۔ اس کے ۳۳ درجات (قواعد وضوابط) ہیں جو خالصتہً رموز یا کوڈ ورڈز (CODE WORDS) کی شکل میں ہیں۔ بظاہر یہ لوگ بنی نوع انسان کی حریت فکر اور آزادی ضمیر اور سماجی کفالت کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ لیکن ان کا اصل مقصد دینی، سیاسی اور نظام حکومت کے مسائل میں جھگڑے برپا کرنا ہوتا ہے۔

یہ فرقہ اپنے ہر درجہ یا منزل پر زیادہ تر رموز یا کوڈ ورڈز سے کام لیتا ہے۔ اراکین تحریک ان رموز کے معانی خوب سمجھتے ہیں۔ اور انہی رموز کے ذریعہ ہدایات وصول کرتے اور اپنے نائبین تک پہنچاتے ہیں جنہیں عام لوگ قطعاً سمجھ نہیں سکتے۔ اسی طریقہ کار سے یہ لوگ کسی آدمی کے روابط اس کے دین، وطن، قوم اور سیاست سے منقطع کرتے ہیں اور اپنی خالص یہودی تنظیم و فرائض کی اشاعت کرتے ہیں۔

اس تحریک کے ارکان کو ایک درجہ سے دوسرے درجہ تک ترقی کرنے کے لئے مختلف قسم کے امتحان دینا پڑتے ہیں۔ اور ہر امتحان کے بعد اس رکن کو بڑے استاد یا سیکرٹری جنرل کی طرف سے سرٹیفکیٹ عطا کیا جاتا ہے پہلے یہ سرٹیفکیٹ عبرانی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ پھر دو زبانوں میں لکھے جانے لگے۔ مقامی زبان میں اور عبرانی زبان میں، لیکن اب صرف مقامی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ تاکہ عام لوگ اس یہودی تحریک سے قریب ہوں۔ اور اس تحریک کی بنیاد کی تاریخ چار ہزار (۴۰۰۰) سال قبل مسیح بتائی جاتی ہے[۱]۔ اس تحریک کے ارکان ہر غیر یہودی اقتدار کے دشمن ہوتے ہیں۔ خواہ یہ دینی نوعیت کا ہو خواہ تمدنی ہو یا سیاسی ہو۔ اور انہی تین کلیدی شعبوں سے متعلق ہی رموز استعمال کئے جاتے ہیں۔ فری میسن کے ارکان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انہی تین شعبوں کو اپنی اغراض کے مطابق ڈھالنے کے لئے کام کرے۔

---

[۱] حالانکہ اس تحریک کے بانی ہیرڈوس اغریپا کا عہد حکومت ۳۷ تا ۴۴ء ہے۔ مترجم

شاہی خفیہ تنظیم اس تحریک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر ملک کے سربراہان، وزراء اور ہر شعبہ کی بڑی بڑی شخصیتوں اور ارباب حل وعقد سے روابط قائم کرے۔ ان لوگوں کو ان کی اغراض کی تکمیل کے لیے مکمل حمایت اور ضمانت کا یقین دلایا جاتا ہے۔ فری میسن کی خفیہ تنظیم کے اس گروہ کو خفیہ شاہی تنظیم کہا جاتا ہے۔ اور اس مخصوص گروہ کا مقصد جیسا کہ تورات میں مذکور ہے۔ یہودی مذہب کا احترام اور فلسطین میں قومی وطنیت کے نام پر یہودی حکومت کا قیام ہے۔ نیز مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمان کی تعمیر بھی ان کا بنیادی مقصد ہے جو ان کی قومیت کا نشان ہے۔ یہ لوگ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے یہودیوں میں اس بات کی اشاعت کرتے رہتے ہیں کہ ان کا مقصد فلسطین میں اسرائیل کی حکومت کا قیام اور ایسے تمام تر علاقوں کی بازیافت ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے قیام فرمایا تھا۔ خصوصاً جزیرہ سینا جہاں طور پہاڑ ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام چڑھے اور اللہ تعالیٰ سے بات چیت ہوئی اور ان پر تورات نازل ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمان کی تعمیر ان کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ تحریک یہودیوں کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ جب تک یہودیوں کے شعائر والے علاقہ جات واپس نہ لیے جائیں ان کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اور جو مالی فنڈ تمام خفیہ تنظیم سے وصول ہوتا ہے وہ سب کچھ اس شاہی خفیہ تنظیم کے مقاصد کی تکمیل پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ گویا شاہی تنظیم عام فری میسن تنظیم کا تتمہ ہے۔

اس شاہی خفیہ تنظیم کی غرض وغایت فلسطین میں "اسرائیل کبریٰ" کی حکومت کا قیام اور اس کی توسیع ہے۔ جو کہ تمام جزیرہ عرب، شام، لبنان، عراق، مصر اور شمالی افریقہ کے بڑے ممالک سے لے کر صحرائے اعظم کے جنوب تک پھیلی ہوئی چاہیئے۔ اسی پلاننگ کی بناء پر اب اسرائیل افریقی ممالک سے

لہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کو اس منصوبہ کا شکار بنانے کے بعد یہودیوں کی اب پاکستان پر نظر خاص ہے جس کا ثبوت اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گورین کی اس تقریر سے ملتا ہے۔ جو اس نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے فوراً بعد پیرس کی سار بون یونیورسٹی میں کی۔ اس نے کھلے لفظوں میں یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"بین الاقوامی صیہونی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہیئے پاکستان درحقیقت ہمارا اعلیٰ اور حقیقی آئیڈیالوجیکل جواب ہے۔ پاکستان کا ذہنی وفکری سرمایہ اور جنگی وعسکری

(بقیہ برصفحۂ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ) قوت و کیفیت آگے چل کر ہمارے لئے کسی وقت بھی مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔ ہمیں اس کا حل سوچنا چاہیئے۔ ہندوستان سے دوستی ہمارے لئے نہ صرف ضروری ہے بلکہ ہمیں اس تاریخی عناد سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ جو ہنود پاکستان اور اس کے بسنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے، یہ تاریخی عناد ہمارا سرمایہ ہے۔ لیکن ہماری پالیسی ایسی ہونی چاہیئے کہ ہم بین الاقوامی دائروں ہی کے ذریعہ ہندوستان سے اپنا رابطہ رکھیں"۔

(یروشلم پوسٹ ۹ اگست ۱۹۶۷ء، نوائے وقت ۲ جولائی ۱۹۷۱ء)

اس کے علاوہ پاکستان کی دلی وابستگیاں چونکہ عالم عرب کے ساتھ ہیں۔ اس لئے بھی پاکستان یہودیوں کی نظر میں خار کی طرح کھٹک رہا ہے، اور وہ یہود کو پاکستان کے خلاف ہر ممکن طریق سے برسرِ پیکار رکھے ہوئے ہیں۔

پاکستان میں ان کا سب سے بڑا سہارا اسلام بیزار مغرب زدہ طبقہ ہے جسے یہ ہر قسم کا عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچا کر بلطائف الحیل اپنی مقصد برآری کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ جس کی تائید اس کتاب سے ہوتی ہے جو حال ہی میں امریکہ کی کونسل برائے تعلقات خارجہ نے "مسلم مشرق" پر شائع کی ہے اور اسے کولمبیا یونیورسٹی کے مشہور یہودی پروفیسر جی سی ہیروچیٹر نے (MIDDLE EAST POLITICS AND MILITARY) کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں دیئے گئے اعداد و اسناد بین الاقوامی پشت پناہی کا ہی نتیجہ ہیں۔ جسے اس عالمی شہرت کے یہودی پروفیسر نے بڑی کاوش سے جمع کیا۔ وہ تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنے قارئین کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

"پاکستانی مسلح افواج نظریہ پاکستان، اس کے اتحاد و سالمیت اور استقلال کی پاسبان بنی ہوئی ہیں جبکہ ملک کی سول ایڈمنسٹریشن مغرب زدہ ہے۔ اور نظریہ پاکستان پر یقین نہیں رکھتی"۔

یہ نتیجہ جہاں یہودیوں کی بین الاقوامی تحریک کے رہنماؤں کے لئے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے وہاں ہمارے لئے بھی اپنے اندر عبرت و بصیرت کا خزانہ لئے ہوئے ہے جس کی تائید ان حالات و واقعات سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ مشرقی پاکستان سے ہم کو محروم کر دیا گیا ہے۔

اس منصوبہ کو بغور پڑھنے کے بعد انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ یہ منصوبہ ساز کتنی عظیم شخصیت تھی۔ جس نے حالات زمانہ، فطرت انسانی اور فن حکمرانی کو سامنے رکھ کر اپنی ذہانت و فطانت سے ایک ایسا منصوبہ تشکیل دیا کہ دنیا کی کوئی حکومت اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے دنیا میں غیر ملکی قرضوں، مناقشات، تنازعات اختلافات، فحاشی، بدمعاشی، بدقماشی، فریب کاری اور دھنگائی کا چکر چلا کر سب کو اپنے دام تزویر میں پھانس رکھا ہے۔ دنیا میں رونما ہونے والا ہر بڑا واقعہ اس سازشی منصوبہ کا نتیجہ ہے۔ اسی کی وجہ سے آئے دن

باقی اگلے صفحہ پر

اپنے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ کہیں مالی امداد و اعانت کی جاتی ہے۔ کہیں اقتصادیات پر قابو پایا جاتا ہے اور کہیں ان ممالک کی تنظیموں میں جھگڑا و فساد برپا کیا جاتا ہے تاکہ جب بھی بن پڑے ان ممالک میں آسانی سے اقتدار حاصل کیا جا سکے۔ اس تحریک کے ارکان کے چار درجے ہیں، مبتدی، کارکن، استاذ، اور رفیق (کامریڈ) کامریڈ فری میسن کا سب سے بلند درجہ ہے۔ لینن، سٹالن، ٹراٹسکی وغیرہ سب کامریڈ تھے

سرخ فری میسن یا اشتراکیت

یہ تنظیم عموماً یہودی تنظیم نہیں سمجھی جاتی۔ کیونکہ اس میں شاہی خفیہ تنظیم کے چند افراد کی شمولیت کے سوا بظاہر اس کا یہودی تنظیموں میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اور یہ چند لوگ جو اس میں شامل ہوتے سب رومی النسل یہودی ہیں۔ اس فرقہ کی غرض و غایت تمام عالم میں لاقانونیت اور بے چینی کی عام لہر دوڑا کر اور اضطراب پیدا کر کے شاہی خفیہ تنظیم کے لئے میدان ہموار کرنا ہے اور یہ بات ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اشتراکیت کی تنظیمیں جو اقصائے عالم میں کام کر رہی ہیں، سب صہیونی یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جو انہیں مناسب ہدایات دیتے، ان کی مالی امداد کرتے اور دوسری اقسام کی مدد اور توجہ دیتے رہتے ہیں اور ان کے آلۂ کار وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ملک میں کسی نہ کسی طرح کا تفوق رکھتے ہیں۔

اشتراکیت بھی عالمی صہیونیت کی ایک شاخ اور اسی کی آلۂ کار ہے۔ عالمی اشتراکیت اور عالمی صہیونیت کے درمیان ایسے خفیہ روابط پائے جاتے ہیں کہ سرخ اشتراکیت عالمی صہیونیت کے مرکز اعلیٰ کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر تمام دنیا کی فضا اس کے لئے سازگار بنا رہی ہے۔

اس گروہ کی غرض و غایت یہودیوں اور ماسونیوں کی وساطت سے روم میں اپنی حکومت کا قیام ہے۔ جس پر ان کے بزرگ حکمران رہ چکے ہیں۔ جس طرح ان کے بزرگ نیرون نے روم کو تہس نہس کیا تھا۔ یہی کچھ کر کے یہ لوگ روم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس گروہ کی ایک ایسوسی ایشن نیویارک (امریکہ) میں قائم ہے۔ جس میں یہودیوں کے بھی خاص خاص اشخاص ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کے اجلاس کب اور کہاں ہوتے ہیں۔ اس کے ممبران اور خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ [ل]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱ سے آگے

حکومتوں (خصوصاً اسلامی ممالک) میں انقلاب برپا کئے جا رہے ہیں اور پاکستان میں اس کے ایجنٹ علانیہ تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں جو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں۔ (مترجم بحوالہ نوائے وقت ۲ اکتوبر ۷۸ء)

[ل] ان ممبران میں سے کوئی راز فاش کرے، یا ضوابط کی پابندی نہ کرے یا باغی ہو جائے۔ تو اسے اس طرح مروا دیا جاتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ طبعی موت مرا۔

یہی لوگ مختلف وسائل کو بروئے کار لاکر، یہودی مال و دولت سے کام لے کر مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے تنظیمیں قائم کر کے، تمام دنیا میں اقتصادی سیاسی اور اجتماعی زندگی میں اضطراب پیدا کرتے اور لوگوں کے ضمیر خریدتے ہیں۔ اور مسیحیت کو دنیا سے نیست و نابود کر کے نیز دوسرے ادیان کا خاتمہ کر کے تمام عالم کو یہودی بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔

اس ایسوسی ایشن کا طریق کار یہ ہے کہ وہ طلبہ اور مزدوروں میں تخریبی تحریکیں چلا کر عام بے چینی کی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مختلف ممالک میں رہنے والے یہودیوں کو ان ممالک کے بڑے لوگوں سے رابطہ قائم کر کے انہیں ہر طرح سے اطمینان مہیا کیا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ اسرائیلی ہوں اور یورپ یا امریکہ کے باشندے ہوں۔ ایسے یہود کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اسرائیلی فوج کی امداد بھی کریں اور خود بھی اپنے وطن موعود اسرائیل کی خاطر ۲ سال جبری فوجی ٹریننگ حاصل کریں۔ جس کی صورت یہ ہے کہ وہ ہر سال تین ہفتے کے لیے اسرائیل جائیں اور جدید جنگی اسلحہ کی تکنیک اور تربیت حاصل کریں۔ بلاد اسلامیہ کے بعض ذمہ دار افراد یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے یہودی برضا و رغبت اسرائیل جاتے ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ لوگ خالص یہودی النسل ہوتے ہیں اور اسرائیلی حکومت انہیں بلاد اسلامیہ سے جنگ سے قبل نہایت خفیہ طور پر اپنے ہاں بلا لیتی ہے۔ تاکہ وہ مادر وطن کا دفاع کر سکیں۔ یہ بات مجھے بعض یورپین یہودیوں سے بنفسِ نفیس معلوم ہوئی ہے کہ یہ لوگ عربی دنیا کی ہلاکت کے لیے اسرائیلی خواہشات کے آلہ کار ہوتے ہیں۔

شاہی خفیہ تنظیم اور سرخ اشتراکیت کا باہمی تعلق

ان دونوں تنظیموں کا ہدف یا آخری منزل ایک ہی ہے۔ شاہی خفیہ تنظیم اس لئے قائم کی گئی کہ فلسطین میں اسرائیل کی حکومت قائم ہو۔ بعد ازاں عربی ممالک پھر شمالی افریقہ کے جنوب تک کے ممالک کو حکومت اسرائیل کا مطیع و منقاد بنا کر انہیں یہودی بنایا جائے۔ اور اشتراکیت کے طریقے بروئے کار لاکر تمام دنیا کی فضا کو یہودیت کے لئے سازگار بنایا جائے اور ان کے اس ہدف کو اس خوف سے ظاہر نہیں کیا جاتا تاکہ تمام دنیا ان کے ناپاک عزائم سے آگاہ ہو کر ان سے برسرِ پیکار نہ ہو جائے اور ان پر عرصہ حیات تنگ نہ کر دے۔ سو یہ قرار پایا کہ اشتراکیت اپنے انتظامات کے علاوہ دوسرے ممالک میں یہ اسلوب اختیار کرے کہ چھوٹوں (نوجوانوں) کو جو ناپختہ عقل ہوتے ہیں اور غریب مزدوروں اور کسانوں کو استعمال کیا جائے اور انہیں دھوکہ دے کر پراگندگی بپا کی جائے۔ جب اس کام کی تکمیل ہو جائے تو بلا خوف و خطر تمام دنیا پر یہودی حکومت

کا اعلان کر دیا جائے۔ بعدازاں اسباط اسرائیل کی اولاد میں سے کسی کو بادشاہ مقرر کر دیا جائے۔ جو تمام دنیا کا بادشاہ ہوگا اور ایسی یہودی حکومت، مارکس، لینن، ہرزل، زنجفیل اور توردو کے پلیہ کے لوگوں کی وساطت سے قائم ہو سکتی ہے اور یہ سب لوگ صہیونی اشتراکیت کے عمائدین تھے جنھوں نے عام دینی، طبعی اور سیاسی بنیادوں کو مسمار کیا۔ تاکہ اشتراکیت کی بنیادیں استوار کی جائیں۔ یہ سب لوگ تخریب کار تھے کیونکہ ان کے اعمال کے نتائج فتنہ وفساد کی شکل میں رونما ہوئے۔ اشتراکیت ایک خطرناک بیلچہ ہے جو اجتماعی تنظیم کو بنیادوں سے اکھاڑ دیتا ہے۔ اشتراکیت کے بانی جو اپنے گمان کے مطابق مزدوروں اور انسانیت کے ہمدرد بن کر معاشرہ سے انتقام پر اتر آتے ہیں۔ اپنے اصول لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے بقول خود مزدوروں کو زندگی بخشنے اور انسانیت کو آرام پہنچانے کے لئے اشتراکیت کا جھنڈا پھیلاتے ہیں۔ حقیقتاً وہ اپنا کام نہایت رازداری سے کرتے اور سوچی سمجھی سکیم کے مطابق حملے کرتے ہیں اور اس طرح دھوکے سے لوگوں کے افکار و نظریات میں تبدیلی پیدا کر کے یہودی صہیونیت کے افکار رائج کرتے، انہیں یہودی شریعت کے تسلیم کرنے کے لئے تیار کرتے اور مسیحی دنیا سے مسیحیت کے خاتمہ کے درپے ہوتے ہیں۔ کسی ملک کے اقتصادی، تمدنی اور اجتماعی امور کو بداخلاقی اور اپنے تخریبی کاموں سے تباہ کر دیتے ہیں۔ اور جو شخص صہیونیت کے دانشوروں کے پروٹوکول (قواعد وضوابط) کو جانتا ہے۔ اسے قوی دلائل کی بناء پر یہ ثبوت مل جاتا ہے کہ عامۃ الناس کے لئے عموماً اور مسیحی دنیا کے لئے خصوصاً ان کے عزائم کس قدر ناپاک ہیں۔ عالمی صہیونیت کے یہ اغراض ومقاصد عالمی اشتراکیت کے پس پردہ چھپے ہوئے ہیں۔

اشتراکیت کے زعماء غیر یہودی ممالک کی امداد کیوں کرتے ہیں؟

بعض اشتراکیت کے علمبردار غیر یہودی ممالک کی مالی اور افرادی امداد کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد حکومت میں اثر ونفوذ حاصل کر کے اور جمہوریت کے ذریعہ اپنے وفادار اشخاص کو آگے لا کر وسیع تر میدان میں کام کرنے سے اپنے اغراض کی تکمیل کرنا ہوتا ہے۔

اس طرح یہودی اور عالمی صہیونیت عالمی اشتراکیت کی وساطت سے اپنے مقاصد کو پروان چڑھانے کے لئے کوشش کرتی ہے۔ اور بعدازاں جب عالمی اشتراکیت اپنا حلقہ اثر وسیع کرے گی تو عالمی یہودی حکومت کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اور تمام لوگوں کو یہودی بنا کر اشتراکی نظام کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا جائے گا۔

عالمی صہیونیت اور عالمی اشتراکیت میں فرق

اشتراکیت کے علمبردار اس بات میں کوشاں

ہیں کہ اشتراکیت کو سہولت اور سرعت کے ساتھ یورپ، شرقِ اوسط اور شرقِ بعید میں پھیلایا جائے دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی اشتراکیت اپنے اس موقف میں عالمی صہیونیت سے قوی تر معلوم ہونے لگی ہے۔ اشتراکیت دنیا پر پھیلاؤ ضرور چاہتی ہے۔ لیکن لوگوں کو یہودی بنانا نہیں چاہتی جبکہ عالمی صہیونیت لوگوں کو یہودی بنانے کا ارادہ رکھتی ہے اور جب سے عالمی صہیونیت نے دھوکا اور عالمی فریب کی بناء پر اسرائیل کی حکومت قائم کی ہے۔ پھر جنگ حزیران (جون ۱۹۶۷ء) کے بعد پھیلنے لگی ہے۔ اور اب اس نے بلادِ اسلامیہ سے جنگ کا ارادہ کر لیا ہے تو اشتراکیت کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جب بھی عالمی صہیونیت کا بس چلے گا وہ اشتراکیت کو حکومت اسرائیل میں جذب کر لے گی اور دنیا پر اس کی حکمرانی قائم ہو جائے گی۔ اشتراکیت اس حد تک عالمی صہیونیت کی مؤید ضرور ہے کہ فلسطین میں حکومت اسرائیل قائم ہونی چاہیئے لیکن وہ فلسطین سے حدود تجاوز کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ کیونکہ ایک کی وسعت اور قوت دوسری کے زوال کا سبب بن جائے گی۔ اسی لئے ان دونوں تنظیموں کا پوشیدہ اختلاف کافی شدت اختیار کر چکا ہے۔ عالمی صہیونیت اور اشتراکیت دونوں کی چکی اس محور کے گرد گھوم رہی ہے کہ عالمی اقتدار کے معاملہ میں کونسی تحریک دوسری پر غلبہ حاصل کرتی ہے۔

بعض یورپی اشتراکی ممالک کے حکام پر یہ بات واضح طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ وہ عالمی صہیونیت کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں جسے انہوں نے بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور اپنی عقل کی آواز اور وطن کی ندا کو قبول کرتے ہوتے ان بھونڈے نتائج کو اپنی روشن آنکھوں سے ملاحظہ کیا ہے کہ اشتراکیت نے کس طرح ان کے ملک اور ان کی قیادت، ان کی مذہبی، اقتصادی، اجتماعی، ثقافتی اور اخلاقی حالت کو تخریب کاری کے ذریعہ زیر و زبر کر کے رکھ دیا ہے اور کس قدر جانیں اس دوران ضائع ہوئیں۔ وہ لوگ اشتراکی نظام اور خود اپنی حکومت کے خلاف بھی ایجی ٹیشن کر رہے ہیں۔ اور اشتراکیت کے مادر وطن روس سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ جو کچھ مشرقی یورپ میں رونما ہو رہا ہے۔ وہ اس بات کی وضاحت کے لئے کافی ہے کہ یہ لوگ اشتراکیت کے پردے میں چھپے ہوئے عالمی صہیونیت کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔

غربی ممالک اور صہیونیت مغربی ممالک جن کے سربراہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور امریکہ ہیں انہوں نے ہی عالمی صہیونیت کو پروان چڑھانے کے لئے عربی ممالک میں یہودیت کے بیج بوئے۔ اور اس کی رعایت اور حمایت کے معاہدے کئے۔ حتیٰ کہ یہ تحریک

ابھری، جوان ہوئی اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ پھر اسے معاہدہ بالفور[1] ۱۹۱۷ء کی رو سے مضبوط بنایا گیا۔ اور بزورِ بازو فلسطین میں اسرائیلی طرز کی حکومت کا پلان تیار ہوا اور اس کی اسلحہ سے بھی اور حمایت کے اعلان سے بھی مدد کی گئی۔ اس چھوٹی سی غیر شرعی مملکت کو بنیاد اور مرکز قرار دیا گیا، تاکہ یہاں سے شرق اوسط پر دوسری بار غلبہ حاصل کیا جائے۔ امت اسلامیہ کو ختم کرنے کے لئے سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد خلافت میں ترکی اور عربی ممالک کے درمیانی علاقہ میں فتنہ و فساد برپا کر کے تباہ کیا گیا۔

پھر عالمی صہیونیت نے مغربی ممالک کے بل بوتے پر ترکی کے حکام کے ضمیروں کو خریدا اور مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکی میں تحریک انضباط چلائی گئی تاکہ خلافت اسلامیہ کا مکمل طور پر خاتمہ ہو سکے۔ ترکی میں یہ تحریک کامیاب ہوئی تو مصطفےٰ کمال نے بلادِ اسلامیہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ پہلا کیل تھا جو امت اسلامیہ کی نعش میں ٹھونکا گیا۔ اس طرح یہ حکومت عالمی صہیونیت کی عیاریوں کی وجہ سے اور مغربی استعماری طاقتوں کے واسطہ سے کمزور پڑ گئی، اور یہ سب کچھ ان فوجی انقلابات کے علاوہ تھا جو دنیا میں اور بلاد اسلامیہ میں برپا کیے جا رہے تھے۔ اس طرح حکومت ترکی کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ وہ دین سے یکسر علیحدہ ہو گئی۔ وہ نام کو تو اسلامی سلطنت تھی، مگر

---

[1] یہودی جہاں بھی ہیں بہت مالدار ہیں۔ وہ بعض عیسائی حکومتوں کے وزیر، مشیر بھی ہیں، یورپ، برطانیہ اور امریکہ کے اخبارات اور اقتصادیات پر ان کا قبضہ ہے۔ غرضیکہ وہ عیسائیوں کی ذہنیت اور سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کا فائدہ انہوں نے پہلی جنگ عظیم میں اٹھایا جب عربوں نے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اتحادی فوجوں کے زیر اثر حجاز، اردن اور عراق میں علیحدہ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اتحادی فوجوں نے لبنان، فلسطین اور دیگر عرب ممالک پر قبضہ کر لیا تو ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کے فارن سیکرٹری لارڈ راتھ چائلڈ کو جو برطانیہ میں یہودی فیڈریشن کے صدر تھے، ایک مراسلہ بھیجا کہ حکومت برطانیہ اس سے اتفاق کرتی ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کیلئے نیشنل ہوم بنایا جائے۔ اس کا نام بالفور ڈیکلریشن یا معاہدہ بالفور ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک لاکھوں یہودی فلسطین میں آ کر بس گئے اور دوسری جنگ کے بعد ۱۲ مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کر دی گئی جو بہت جلد ترقی کرتی رہی۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ (جنگ حزیران) میں یہودیوں نے بیت المقدس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور کسی صورت بھی اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں بلکہ مدینہ منورہ پر بھی قبضہ جمانے کی سازش کیے ہوئے ہیں۔ وہ گریٹ اسرائیل (اسرائیل کبریٰ) میں لبنان، اردن، عراق جنوبی ترکی، سینا، سویز کینال، کاٹر د، سعودی عرب کا شمالی حصہ اور کویت شامل کرنا چاہتے ہیں۔

(حاشیہ ۲ اگلے صفحہ پر) (مترجم بحوالہ نوائے وقت ۲۸ جولائی ۱۹۷۸ء)

عملاً علمانی اسیکولر اسلطنت بن گئی۔ پھر سلطنت یہودی اشتراکیت کے چنگل میں پھنس گئی اور فوجی تحاریک کے علمبرداروں کو کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

لیکن جب ماضی قریب میں عالمی یہودی صہیونیت کے عزائم آشکارا ہو گئے۔ اور بعض صاحب بصیرت حکام کو یہ حقائق معلوم ہو گئے، جیسے روس میں قیصر کے حکام کو معلوم ہوتے تھے۔ تو غیرت مند مسلمانوں نے یہودیوں کی شرارتوں سے دنیا کو بچانے کے لیے ان کا سامنا کیا۔ اور ہٹلر ڈکٹیٹر جرمنی نے، جو یہودی اور صہیونی تھا اور مسیحیت کو مٹا کر دنیا کو یہودی بنانا چاہتا تھا۔ ایسے بہت سے لوگوں کا صفایا کر دیا جو کھل کر سامنے آ گئے تھے اور اگر ہٹلر کے مقاصد میں فتح ہوتی تو دنیا ان لوگوں کے یہودی بنانے کے ناپاک عزائم اور شرارتوں سے کبھی محفوظ نہ رہتی، اور اگر یہودی دنیا پر قابض ہو جاتے تو مغربی مسیحی دنیا بذات خود بھی بھیانک انجام سے نہ بچ سکتی۔

لیکن ہٹلر سے مقابلہ کے وقت ان مغربی سربراہان مملکت کی آنکھیں اندھی ہو گئیں اور عقل پہ پردہ پڑ گیا۔ وہ ہٹلر کی شدت ناپسندیدگی کی وجہ سے مقابلہ کر رہے تھے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ کہتا کیا ہے اور یہودی یہ کوشش کر رہے تھے کہ یہ مغربی سربراہان ہٹلر کے انداز فکر اور مسیحیت کو مٹانے کے لئے ہمارے عزائم سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ سو ان یہودیوں نے ان مغربی زعما کا رخ اشتراکیت کی طرف موڑ دیا، تاکہ مل کر ہٹلر کا مقابلہ کیا جائے۔ مغربی زعما اس وقت تک اندھے ہی رہے جب تک کہ اشتراکی مملکت روس، جو کہ عالمی صہیونیت کا نتیجہ ہے، کے تباہ کن اسلحہ کا واقعہ پیش نہ آیا۔ کاش کہ مغربی زعما یہ سمجھ جائیں کہ وہ تمام قربانیاں جو عرب اور مسلمانوں نے اسرائیل کے مقابلہ میں دی ہیں۔ وہ ان قربانیوں کے مقابلہ میں بہت قلیل ہیں جو اگر اس وقت یہودی غالب آ جاتے تو عام دنیا کو عموماً اور مسیحی دنیا کو خصوصاً ان کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے دینا پڑتیں۔ ان یہودیوں کے قدم عربی دنیا میں جم چکے ہیں۔ یعنی افریقہ اور روس اور مشرقی اشتراکی یورپ پر ان کا تسلط ہو چکا ہے۔ جو آہستہ آہستہ مغربی یورپ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور اب مشرق بعید سے ہوتے ہوتے شمال اور جنوبی امریکہ کے بڑے بڑے ممالک پہنچ رہا ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان سب کو یہودی بنا کر دم لیں گے اور عالمی یہودی سلطنت کا اعلان کر دیا جائے۔ کاش کہ مغربی زعماء مسلمانوں اور اسلام سے

حاشیہ ۲ صد سے آگے

۲ ترکی میں خلافت کو ختم کرنے کے مذموم فعل میں چونکہ برطانیہ نے بھی ساتھ دیا تھا۔ لہٰذا متحدہ ہندوپاکستان میں برطانیہ کے خلاف ایک بھرپور تحریک چلائی گئی جسے تحریک خلافت کا نام دیا گیا۔ (مترجم)

ناپسندیدگی اور کینہ نہ رکھتے جبکہ اسلام مسلمانوں کو دوسرے ادیان کے لئے محبت اور احترام سکھلاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ کاش یہ لوگ اپنے کالے لوگوں سے کینہ نہ رکھتے۔ تو یہ سب مل کر یہود کے مقابلہ میں ضرور کامیاب ہوتے اور عالمی اشتراکیت کے لئے بلائے مبرم ثابت ہوتے۔ اسرائیلی حکومت اور دنیا میں یہودیوں کی شان و شوکت ختم ہو جاتی۔ اور اس کے لئے کوئی جنگ بھی نہ لڑنی پڑتی۔ اور عالمی یہودیت کی اس پلاننگ سے انسانیت محفوظ رہتی۔

یہ بات حیرت انگیز اور قابلِ افسوس ہے کہ یہودی اہلِ یورپ اور اہلِ امریکہ کو کمزور سمجھتے ہیں۔ انہیں حقیر جانتے اور اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لئے انہیں استعمال کرتے اور ان سے اپنی بات منوا لیتے ہیں۔ یورپ انگلینڈ، شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے دارالخلافہ ہائے کے لئے خواہ ان حکومتوں کے امور داخلی ہوں یا خارجی۔ تل ابیب سے احکام جاری ہوتے ہیں تاکہ اسرائیل اور عالمی صیہونیت کے مفادات کا پورا پورا لحاظ رکھا جا سکے۔

بنابریں میں تمام دنیا کے صاحبِ عقل و شعور لوگوں کو اور خصوصاً یورپ، انگلینڈ اور امریکہ کے دانشوروں کو پکار کر کہتا ہوں کہ وہ اپنی سیاست میں تبدیلی پیدا کریں۔ عقل و ہوش سے کام لیں۔ اور مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنے دین اور وطن کے مفادات کے لئے فیصلے کریں۔ عالمی صیہونیت اور یہودیوں کی پلاننگ کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں تاکہ انسانیت کو یہود کی ان تباہ کاریوں سے بچا سکیں۔ جو وہ عالمی اقتدار کے حصول کی خاطر برپا کرنا چاہتے ہیں۔

ضروری اعلان

یادِ رفتگاں

علّامہ عبد العزیز میمن کی یاد میں

پروفیسر غلام احمد حریری

۲۷ اکتوبر سالِ رواں علامہ عبد العزیز میمن بھی عازمِ فردوس ہو گئے۔ اخبارات نے سخت بے اعتنائی برتی۔ آپ کے سانحۂ ارتحال کی خبر چند سطروں میں اور ایسے غیر معروف گوشہ میں دی جس کو اخبار بین عام طور سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں نے تو اور بھی سہل انگاری کا ثبوت دیا۔ جامعہ پنجاب اور کراچی کے شعبہ ہائے عربی کے آپ کئی سال سربراہ رہے مگر کسی نے تعزیت میں ایک فقرہ بھی نہ کہا۔ غنیمت ہے کہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے علامہ پر نوائے وقت میں ایک مضمون لکھ کر اور عصر حاضر کے مشہور شاعر جناب عبد العزیز خالد نے ایک نظم کہہ کر حقِ شاگردی ادا کر دیا۔ علامہ میمن مسلک اہلحدیث سے وابستہ تھے۔ مگر اہلحدیث کے ہفت روزہ جرائد نے آپ کا ذکر چند سطروں میں کیا۔ حالانکہ معمولی واعظوں کے سانحۂ وفات کے تذکرے میں کئی کئی صفحے سیاہ کر دیے جاتے ہیں۔ میمن صاحب سید نذیر حسین محدّث دہلوی کے غالباً آخری شاگرد تھے جو ہنوز بقیدِ حیات تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی شاگردی کا فخر بھی آپ کو حاصل تھا۔

میرے خیال میں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثر لوگ حضرت علامہ عبد العزیز میمن کے بارے میں یا تو کچھ نہیں جانتے یا بہت کم جانتے ہیں۔ اس کی دوسری وجہ عصر حاضر کی کور ذوقی بھی ہے۔ آج شہرت عام عوامی واعظوں اور اشتہاری علماء کو حاصل ہے جو چند تقاریر یاد کر کے کراچی سے پشاور تک سٹیج کی زینت بنتے ہیں اور عوام کے لئے تفریحِ طبع اور ذہنی تعیش کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ علمی گہرائی، تحقیق و تدقیق اور ذوقِ تالیف و تصنیف خواص کا حصہ ہیں اور عام لوگوں کے لئے یہ بے کار مشاغل ہیں۔

ان سطور کا راقم آغازِ شعور ہی سے عربی زبان و ادب کا طالب علم رہا ہے (جس میں بحمد اللہ تا ہنوز کوئی فرق نہیں آیا) زمانۂ طالب علمی ہی میں متداول کتبِ ادب تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ قدیم و جدید ادب کی جو کتاب بھی میسر آئی پورے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھ ڈالی۔ البتہ غیر درسی کتبِ ادب آسانی سے دستیاب نہ تھیں۔ ہمارے مدارس کی لائبریریوں میں معروف متداول کتب کے سوا

دوسری کوئی کتاب عنقا کا حکم رکھتی تھی۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ان حلقوں میں کیا اساتذہ اور کیا طلبہ ان کتب کے ناموں سے بھی آشنا نہ تھے۔

خوش قسمتی سے کسی دوست کی معرفت مجھے علامہ میمن کی ایڈٹ کردہ کتاب سمط اللآلی مل گئی۔ علامہ نے کتاب الامالی للاغانی کو بڑی محنت سے مرتب کیا اور اس پر بڑے گرانقدر حواشی تحریر کئے ہیں۔ اسی طرح احقر کو ان کی کتاب "ابوالعلاء وما الیہ" کے مطالعہ کی سعادت بھی حاصل ہوگئی۔ احقر قبل ازیں طٰہٰ حسین کی "ذکری ابی العلاء" بھی مطالعہ کر چکا تھا۔ مگر اس کتاب کا انداز ہی جداگانہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ابوالعلاء کے تذکار و بیان میں ایک عجمی عربی سے گویا سبقت لے گیا۔

یہ کتب پڑھ کر مولانا کے ساتھ عقیدت و محبت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ مگر بظاہر ملاقات کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ اے ایس ٹریٹن پروفیسر آف عربک کے علی گڑھ یونیورسٹی سے چلے جانے کے بعد پروفیسر کی آسامی خالی ہوگئی تھی اور مولانا ان کی جگہ علی گڑھ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی قرار پائے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف مولانا ایک بلند پایہ منصب پر فائز تھے اور احقر ایک ادنیٰ درجہ کا طالبعلم۔ ایک عربی شاعر نے کہا ہے۔

کیف الوصول الی سعاد و دونها قلل الجبال و دونهن حیوف

شاعر کو شکوہ ہے کہ بلند و بالا پہاڑ محبوب کی راہ میں حائل ہیں — اس لئے ملاقات کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ مگر میرے سامنے مولانا کا بلند پایہ منصب اور اس کے ساتھ ساتھ مکانی بُعد ملاقات میں سدِ راہ تھا۔ اسی طرح شب و روز گزرتے گئے، اور مرورِ زمانہ سے میرا اشتیاق و اضطراب روبہ ترقی رہا تا آنکہ مسبب الاسباب حقیقی نے جس کے لئے کوئی بھی چیز انہونی نہیں ملاقات کی ایک تقریب پیدا کر دی۔ ہوا یہ کہ پنجاب یونیورسٹی نے دسمبر ۱۹۵۷ء کے اواخر اور جنوری ۱۹۵۸ء کے اوائل میں ایک بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا۔ ان دنوں میاں افضل حسین مرحوم پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور مولانا محمد شفیع مرحوم پرنسپل اورنٹیل کالج مجلس مذاکرہ کے ناظم تھے۔ احقر ان دنوں اسلامیہ کالج لائل پور میں لیکچرار تھا۔ یونیورسٹی کو ایسے اہل علم مطلوب تھے جو بیرون ملک سے آمدہ مقالات کا انگریزی سے عربی اور عربی سے انگریزی میں ترجمہ کر سکیں۔ چنانچہ میاں صاحب نے ہمارے پرنسپل کو خط لکھ کر احقر کو اس مقصد کے لئے یونیورسٹی کے مہمان اور مندوب کی حیثیت سے لاہور بلا لیا۔ ہنوز مذاکرہ کے انعقاد میں ایک ماہ باقی تھا۔ اسی مقصد کے پیش نظر دو اور اصحاب بھی لاہور پہنچ چکے تھے۔ جن میں سے ایک عربی الاصل عبدالمنعم العدوی ایڈیٹر "العرب" کراچی اور

دوسرے ڈاکٹر فضل الرحمٰن تھے جو مرحوم صدر ایوب کے زمانہ میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ناظم مقرر ہوتے اور اپنے ملحدانہ نظریات کی بناء پر وہاں سے نکالے گئے۔ اس وقت وہ انگلینڈ کی ڈرہم یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ ہم تینوں کو لاہور کے پرنس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور ہم مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم کی زیر سرپرستی ترجمہ کا کام انجام دیتے رہے۔

چونکہ کمرے قریب قریب تھے۔ اس لئے باہم ملاقات کے مواقع اکثر میسر آتے۔ دورانِ گفتگو السعدوی صاحب مولانا میمن کی مبالغہ آمیز حد تک تعریف کرتے۔ وہ خود فرماتے کہ ہم عرب لوگ عجمی نژاد لوگوں کی عربیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ البتہ علامہ میمن استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے میری آتشِ شوق میں مزید اضافہ ہوتا۔ مذاکرہ کے انعقاد سے ایک ہفتہ قبل بیرونی مندوبین آنا شروع ہو گئے میری مسرت کی انتہا تھی کہ مولانا میمن بھی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ کے یہاں فروکش ہوئے جو ان کے علی گڑھ کے تلامذہ میں سے ہیں اور ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر آف عربک تھے۔ پھر کیا تھا روزانہ مولانا کے ساتھ گھنٹوں ملاقات رہتی اور ان کے ادبی لطائف و ظرائف سے مستفید ہونے کا موقع ملتا۔ میری دلچسپی کو دیکھ کر مولانا بھی خصوصی شفقت فرمانے لگے۔ دورانِ گفتگو میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں آپ کے ساتھ سلسلۂ تلمذ وابستہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی صورت یہ ہو گی کہ کتاب العمدہ لابن رشیق اور عقد الفرید لابن عبد ربّہ کے بعض مقامات جو دورانِ مطالعہ میری سمجھ میں نہیں آئے میں آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے بخوشی اسے منظور فرمایا اور چند نشستوں میں سب مشکلات حل کر دیں۔

مجلس مذاکرہ کا آغاز ہوا تو بیرونی ممالک کے اکابر فضلاء دور دراز ممالک سے تشریف لا کر لاہور کی زینت بنے۔ مصری فضلاء میں شیخ ابو زہرہ عبدالوہاب عزام اور ڈاکٹر عبداللہ دراز (جنہوں نے لاہور ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مشہور شامی محدث الشیخ بہجۃ البیطار سے بھی شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ لبنانی الاصل امریکی مستشرق ہِٹی سے بھی اکثر ملاقات رہتی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سب عرب علماء اور مستشرقین مولانا میمن کی وسعتِ علم تحقیق و تدقیق اور زبردست قوّتِ حافظہ کے مدّاح تھے۔ جب کسی اجلاس میں مولانا میمن موجود ہوتے تو عرب فضلاء کی موجودگی میں قرعۂ صدارت مولانا میمن کے نام نکلتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا ایک اجلاس کی صدارت کر رہے تھے جس میں مختلف موضوعات پر بارہ ۱۲ مقالات پڑھے گئے۔ اس مجلس میں احقر نے بھی حضرت حسانؓ بن ثابت اور ان کی شاعری پر ایک مقالہ پیش کیا۔ مقالہ خوانوں میں عرب علماء بھی موجود تھے جب مقالہ خوانی

ختم ہوئی اور مولانا صدارتی تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو آپ نے ایک ایک مقالہ پر ناقدانہ تبصرہ کیا۔ "دیوانِ حسان رضی اللہ عنہ" سے متعلق آپ نے آدھ گھنٹہ تقریر کی اور بتایا کہ کس کس ملک کی کس کس لائبریری میں اس کے مخطوطے موجود ہیں۔ عرب علماء کے مقالات پر رواں دواں عربی میں اظہار خیال کیا اور ان کی لسانی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ ان اغلاط کو خود عربوں نے بھی تسلیم کیا۔ میمن صاحب کی صدارتی تقریر کیا تھی۔ نادر علمی معلومات کا بحر زخار تھی اور شیخ ابو زہرہ کے پایہ کے علماء دم بخود تھے۔ عرب علماء کے ساتھ کسی مسئلہ پر جب بھی نوک جھونک ہوتی، میمن صاحب کا پلہ بھاری رہتا اور آپ ان کو اپنی بات منوا کر چھوڑتے۔ مجلسِ مذاکرہ میں اکثر بلادِ عرب کے جید افاضل اور نادرۂ روزگار علماء موجود تھے۔ مگر میمن صاحب سے وہ یوں جھک کر ملتے جیسے ادنیٰ شاگرد اپنے استاد کے سامنے آداب بجا لاتا ہے۔

مجھے ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی اس بات سے کامل اتفاق ہے کہ عرب دنیا برصغیر کے صرف تین علماء کو مانتی ہے۔ (۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۲) مولانا عبدالعزیز میمن (۳) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سعودی عرب کے سفر میں مجھے اس کا عملی تجربہ بھی ہوا۔ جہاں علامہ میمن کا اثر بہت کم ہے۔ مقابلتہً علمائے مصر و شام علامہ میمن کے نام اور کام سے زیادہ باخبر اور ان کی مدح و توصیف میں رطب اللسان ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہنوز سعودی عرب میں علم و ادب کا وہ چرچا نہیں جو مصر و شام کا طرۂ امتیاز ہے اگرچہ سعودی حکومت کی مساعی جمیلہ اشاعتِ علم و ادب کے سلسلہ میں لائق مدح و ستائش ہیں۔ ہمارے ملک کے وہ اصحابِ جبہ و دستار جو جگہ جگہ اپنے علم کا ڈھنڈورہ پیٹتے پھرتے ہیں۔ عالم عرب ان کے نام تک سے آگاہ نہیں۔ آخر انہوں نے کون سا تحقیقی کام کیا ہے جو ان کے لئے زندگی جاوید کا ضامن ہو سکے؟ اشتہاروں کی زینت بننے سے تو کوئی شخص حقیقی عالم نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے علم کی سچی لگن اور جگر کاوی کی ضرورت ہے جو علامہ میمن کی خصوصیت تھی۔

بہرکیف مولانا میمن چلے گئے اور ہر کسی کو اس دنیائے فانی سے جانا ہے ؎

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید   زجامِ دہر مئے کل من علیہا فان

بقول عبدہ بن الطبیب مولانا اس شعر کے مصداق تھے ؎

فما کان قیسٌ ھلکہ ھلکُ واحدٍ   ولکنہٗ بنیانُ قومٍ تھدّما

ابو الطیب المتنبی نے تعزیت کا یہ بہترین انداز اختیار کیا ہے کہ ؎

الا انما کانت وفاۃ محمد   دلیلاً علی ان لیس للہ غالب

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا جو نادر علمی معلومات اپنے ساتھ قبر میں لے گئے، اب ان

کے کشف و اظہار کا کوئی ذریعہ نہیں۔ علامہ میمن نے پوری دنیائے علم کی سیاحت کی اور جی بھر کر لائبریریوں سے استفادہ کیا تھا۔ وہ اقصائے عالم میں طلبِ علم میں گھومتے پھرے تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ کون سا علمی مخطوطہ کس لائبریری میں محفوظ ہے۔ وہ عربی زبان و ادب کے اعتبار سے برصغیر کے "طٰہٰ حسین" تھے۔ وہ اپنے عدیم النظیر حافظہ کی بناء پر حفاظِ حدیث اور علمائے سلف کی تابندہ مثال تھے۔ انہوں نے جو بے نظیر ادبی کام کیا ہے وہ ان کو زندۂ جاوید بنانے کے لئے کچھ کم نہیں۔ مگر انہوں نے اپنی یادداشتوں کو ضبطِ تحریر میں لانے کا اہتمام نہیں کیا۔ افسوس کہ ان کے لائق شاگرد ڈاکٹر محمد یوسف سابق پروفیسر آف عربک کراچی یونیورسٹی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ورنہ وہ کسی حد تک اس کی تلافی کرتے۔ میرے خیال میں اب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر آف پنجاب یونیورسٹی کی ذات سے یہ امید وابستہ کی جا سکتی ہے کہ آپ اپنے دورِ طالب علمی کی یادداشتوں اور مولانا کی شاگردی کے ایام کے واقعات کو کتابی صورت میں علمی دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا میمن کے بعد عربی زبان و ادب کے اس خلاء کو پُر کرنے والی شخصیت برصغیر میں اگر کوئی ہے تو وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ذاتِ گرامی ہے۔ ورنہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے بعد پاکستان میں یہ خانہ خالی نظر آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب الطبیں اور اس عظیم علمی نقصان کی تلافی کریں۔

مولانا میمنؒ کی یاد میں چند افکارِ پریشان تھے جن کو اس معذرت کے ساتھ حوالۂ قرطاس کر رہا ہوں کہ سے

میرے قلم میں ادیبوں کی آب و تاب نہیں
متاعِ دیدۂ خونناب لے کے آیا ہوں

تعارف و تبصرۂ کتب

(۱) کلیسا اور آگ	از نسیم حجازی

ضخامت ۴۲۸ صفحات	سفید کاغذ، عمدہ کتابت طباعت

قیمت بیس ۲۰ روپے	ناشر - قومی کتب خانہ - ۱۹ فیروز پور روڈ، لاہور

مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ اپنے اندر عبرت و موعظت کی سینکڑوں داستانیں سمیٹے ہوئے ہے۔ ہندوستان پر قریباً "آٹھ سو سال تک فرزندانِ توحید نے بڑے شکوہ سے حکومت کی، ہسپانیہ (اسپین) میں ساڑھے سات سو برس تک ان کے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر رہا۔ صقلیہ (سسلی) پر تین صدیوں تک پرچم اسلام لہراتا رہا۔ خلافتِ روم صدیوں تک ایک عظیم الشان طاقت بنی رہی۔ دنیا کے تاریک ترین اور دور دراز گوشوں کو بھی مسلمانوں نے اپنے علم اور تہذیب سے منور کر دیا لیکن پھر ایک دن چشم فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ وہ خطہ ہائے زمین جن پر اولوالعزمانِ اسلام نے صدیوں تک اپنے فضل و کمال اور جاہ و جلال کا علم بلند رکھا۔ بالآخر انہی کے اخلاف کے لئے تنگ ہو گئے۔ یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ اس کا جواب بڑا طویل اور جگر خراش ہے۔ مختصر یہ کہ مسلمان اپنا کردار کھو بیٹھے۔ موت ان کی نظر میں ہلاکت بن گئی۔ جہاد فی سبیل اللہ اور فقر و عشق ان کے لئے قصہ پارینہ بن گئے نتیجہ ظاہر ہے۔

جنابِ نسیم حجازی ہمارے کاروانِ عظمتِ رفتہ کے ان حدی خوانوں میں سے ہیں جن کے سینے میں ایک مرد مومن کا دل دھڑکتا ہے اور جو اپنی قوم کو ایک بار پھر اپنی عظمتِ رفتہ کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ قوم کے جذبۂ عمل کو مہمیز لگانے کے لئے وہ اب تک متعدد کتابیں ناول کے پیرائے میں لکھ چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی تازہ ترین تخلیق ہے۔ جس میں ان کے ولولہ انگیز اندازِ تحریر کی خوبیاں پوری طرح نمایاں ہیں۔ اس کتاب کا تعلق سرزمینِ اندلس (اسپین و پرتگال) سے ہے اور خود ان کے الفاظ میں "یہ کتاب ایک قوم کی المناک داستان کا آخری باب ہے۔ جو قریباً آٹھ صدیاں عروج و زوال کی منازل طے کرنے کے بعد اُس سرزمین سے نابود ہو گئی تھی جہاں آج بھی دنیا بھر کے سیاح اس کی عظمتِ رفتہ کی یادگاریں دیکھنے آتے ہیں" جناب نسیم حجازی کی شخصیت، ان کا سوز دروں اور غایت درجہ دلچسپ تاریخی اور ادبی شہ پارے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی ان کی

دوسری کتابوں کی طرح ہر لحاظ سے پڑھنے کے قابل ہے۔ جناب نسیم حجازی اس کی تصنیف پر اور قومی کتب خانہ لاہور صوری و معنوی خوبیوں سے مالا مال اس کتاب کی اشاعت پر ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔

(۲) مذہب اور تجدید مذہب
از جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم
ضخامت ۲۲۲ صفحات، مجلد
قیمت ۵۰-۱۶ روپے
ناشر - البدر پبلی کیشنز - ۴۰ بی اردو بازار لاہور

یہ کتاب نامور مفکر، ادیب اور صحافی پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم و مغفور کی گرانقدر تصنیف ہے، جسے البدر پبلی کیشنز نے نہایت حسین و جمیل انداز میں شائع کیا ہے۔ افسوس کہ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی فاضل مصنف خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے اور وہ اس کو مطبوعہ صورت میں نہ دیکھ سکے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں بڑے دلنشین انداز میں بتایا ہے کہ مذہب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، بگاڑ کے اسباب اور اس کی مختلف صورتیں کیا ہیں، مذہب کے بغیر انسانیت کی کیا حیثیت ہے، اسلام کے تاریخی ارتقاء کی نوعیت کیا تھی، اسلام کی مذاہبِ عالم پر فوقیت کی کیا وجہ ہے، تجدید مذہب کے مقاصد اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور تجدید دین کی دشواریاں اور ان کا حل کیا ہے۔ کتاب کا اندازِ نگارش شروع سے اخیر تک نہایت شگفتہ و رُفتہ ہے۔ اس کا مطالعہ نہ صرف معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ بلکہ فکر و نظر کی کئی اُلجھنوں کو سلجھا دیتا ہے۔ کتاب کے آخر میں فاضل مصنف نے تجدید اور تجدد کا فرق اس طرح واضح کیا ہے:

"بعض لوگوں نے غلطی سے تجدید کو تجدّد کا ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ ان کے نزدیک تجدید کا کام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دین کے اندر ایسی نئی نئی باتیں نہ پیدا کی جائیں جن کا نہ پہلے کوئی نام و نشاں ملتا ہو اور نہ اس کے مزاج سے کوئی مناسبت رکھتی ہوں۔ مجدّدین کا انداز تجدّد پسندوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ مجدّد دین کے اندر کوئی نئی طرح نہیں ڈالتے بلکہ دین کی پرانی روایات اور تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے تحت نئے طرزِ استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔"

یہ کتاب اسبابِ زوالِ امت کے بعض نئے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی ہے اور تبلیغِ حق اور

اصلاحِ معاشرہ کے لئے بھی لمحۂ فکریہ مہیا کرتی ہے ہمیں امید ہے کہ دینی حلقوں میں یہ کتاب بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ آج کے دور میں اس قسم کے فکری لٹریچر کی جس قدر ضرورت ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے کہ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز بھی اس کتاب کو ایسے خوبصورت انداز میں شائع کرنے پر تحسین کا مستحق ہے۔

(۳) خاصانِ خدا کی نماز

از مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری

ضخامت ۱۱۲ صفحات مجلد

سفید کاغذ۔ عمدہ کتابت وطباعت

قیمت -/۵ روپے

ناشر۔ البدر پبلی کیشنز ۴۰۔بی اردو بازار لاہور

مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری کا نام بھارت اور پاکستان کے دینی اور علمی حلقوں کے لئے محتاجِ تعارف نہیں وہ ایک نہایت درد مند اور صاحبِ دل عالم باعمل ہیں جو سالہا سال سے ہندو تہذیب کے مرکز بنارس میں بیٹھ کر اسلام اور دین واخلاق کی مجاہدانہ انداز میں تبلیغ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اب تک اردو اور ہندی میں متعدد ایمان افروز کتابیں لکھ چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کس طرح نماز پڑھتے تھے اور اس میں ان کے خشوع وخضوع اور شوق واہتمام کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ کتاب انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا ہے اور اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں خیر وبرکت اور لذت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر مسلمان گھرانے میں ایسی پاکیزہ کتابوں کی موجودگی فلاحِ دارین کا باعث ہو سکتی ہے۔ اگر کتاب کے آغاز میں ۲ اضافہ ہو جاتا۔ تاہم موجودہ صورت میں بھی یہ کتاب کچھ کم نفع مند نہیں۔

(حاشیہ:) فہرست مضامین بھی دی جاتی تو اس کی افادیت میں

(۴) تیس پروانے شمع رسالت کے۔

از جناب طالب الہاشمی

ضخامت ۵۱۲ صفحات بڑا سائز

سنہری ڈائی دار جلد۔ سفید کاغذ

کتابت طباعت نہایت عمدہ

قیمت چالیس ۴۰ روپے

ناشر۔ مکتبہ چراغِ اسلام۔ ۴۰ بی اردو بازار لاہور

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، انبیاء علیہم السلام کے بعد وہ نفوسِ قدسیہ ہیں کہ جن سے بہتر انسانوں پر آفتاب طلوع نہیں ہوا۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کے بارے میں مروی ہے:

"الصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم"

حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شخصیتوں کی تجلیات' ایمان وکردار کو پھیلانا ایک عظیم کام ہے۔ مشہور سیرت نگار اور صاحب طرز ادیب جناب طالب ہاشمی صاحب کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ وہ مدتوں سے بڑی تندہی اور ذوق و شوق کے ساتھ یہ عظیم کام انجام دے رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں انہوں نے تیس صحابہ کرام رض کے مستند اور مفصل حالات ایسے دلکش اور دلنشین انداز میں ان نفوس قدسیہ کے نقوشِ قدم پر چلنے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ کتاب کا مقدمہ ادیب شہیر مولانا ماہر القادری مرحوم مدیر "فاران" کراچی نے لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے بجا طور پر فرمایا ہے:-

"جنابِ طالب ہاشمی کی زبان شگفتہ، قلم منجھا ہوا اور اسلوب نگارش بے حد دلچسپ' سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کے قلم اور دل ودماغ میں کوئی ژولیدگی نہیں، انہوں نے سلجھی ہوئی طبیعت پائی ہے۔ اس لئے تحریر میں سلجھاؤ پایا جاتا ہے۔ جہاں اطناب ہے وہاں قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا اور جہاں ایجاز ہے وہاں طبیعت گھٹن اور انقباض کی بجائے انشراح وانبساط محسوس کرتی ہے"

یہ تبصرہ اتنا جامع ہے کہ اس پر مزید کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمیں مولانا ماہر القادری کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ فتنۂ معاصرت برسی بلا ہے۔ آج چاہے ان کی تاریخ نگاری کا کماحقہٗ اعتراف نہ کیا جائے، مگر مستقبل کے اربابِ علم ونظر طالب ہاشمی صاحب کو بلند پایہ مؤرخ تسلیم کریں گے۔ فاضل مؤلف اس سے پہلے دوسری متعدد کتابوں کے علاوہ سیرتِ سعد رض بن ابی وقاص، سیرت حضرت عبداللہ بن زبیر رض، سیرت حضرت ابوایوب انصاری رض، سلطان نورالدین محمود زنگی، ملک شاہ سلجوقی اور الملک الظاہر بیبرس لکھ کر علمی حلقوں سے زبردست خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اس سلسلۂ ذہب کی تازہ کڑی ہے۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے مطالعہ کے

قابل ہے اور ہر مسلمان گھرانے میں رکھے جانے کے لائق ہے۔ بوڑھے جوان عورتیں اور بچے سبھی اس کے مطالعہ سے بے حد و حساب فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ جناب ہاشمی صاحب کو اس میدان میں بیش از بیش کارنامے سرانجام دینے کی توفیق ارزانی عطا فرمائے۔

بعض عربی اشعار میں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں امید ہے آئندہ ایڈیشن میں انہیں دور کر دیا جائیگا۔

"مکتبہ چراغِ اسلام" بھی مبارکباد کا مستحق ہے کہ انہوں نے اس گرانقدر کتاب کو ایسے حسین و جمیل انداز میں شائع کیا جو فی الواقع اس کے شایانِ شان تھا۔

گرانی کے اس ہولناک دور میں چالیس روپے قیمت اگرچہ حد سے زیادہ نہیں پھر بھی ہماری خواہش ہے کہ ایسی کتابوں کی قیمت کم ہو تا کہ کم استطاعت رکھنے والے اصحاب بھی انہیں خرید سکیں اور اس طرح دین و اخلاق کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو سکے۔ کوئی اچھی لائبریری اور صاحبِ ذوق گھرانا اس کتاب سے خالی نہیں رہنا چاہیئے۔

(از ہ ر ب ۔ اے)

فہرست مضامین محدث جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۱ تا نمبر ۱۲ (محرم الحرام تا ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ)

Regd. No. L. 7895 Phones : 352897 - 63210

Monthly MOHADDIS Lahore-16

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL